مثیلِ عیسیٰؑ - علی مرتضیٰؓ

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک جامع اور فکر انگیز خطاب

ترتیب و تدوین

(شیخ) جمیل الرحمٰن

شائع کردہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔فون:35869501-3

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی عرصۂ دراز سے یہ خواہش تھی کہ چوتھے خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مبارکہ پر گفتگو کریں۔ لگ بھگ بیس برس قبل لاہور کی ایک انجمن کے زیر اہتمام محترم ڈاکٹر صاحب کو جب حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرتوں پر خطاب کرنے کا موقع ملا تو آپ نے منتظمین انجمن سے برملا کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے چوتھے خلیفۂ راشد کا یوم منانے کا اہتمام نہ کیا تو آئندہ وہ ان کے جلسے میں تقریر کے لیے نہیں آئیں گے۔ لیکن بعد ازاں بعض دیگر اداروں کی طرح وہ ادارہ بھی غیر فعال ہو گیا، اور غالباً آئندہ ان کے زیر اہتمام کسی جلسے کی نوبت ہی نہ آئی۔ قریباً دس بارہ سال قبل ربیع الاوّل کے مہینے میں خالق دینا ہال کراچی میں سُنّی کونسل کے زیر اہتمام طے ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سیرِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے جلسوں کے سلسلے کی ایک شام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر گفتگو کریں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی اچانک علالت کی وجہ سے یہ پروگرام بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

پھر ۱۱ جون ۱۹۸۶ء کو انجمن فکرِ اسلامی جھنگ کے زیر اہتمام سیرتِ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ڈاکٹر صاحب کے خطاب نے ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ چنانچہ جامع مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں ۱۲ اور ۱۹ جون ۱۹۸۷ء کے دو خطباتِ جمعہ میں مقامِ صدیقیت اور مقامِ شہادت کا مفصّل بیان ہوا اور پھر جمعہ ۲۶ جون کو اس سلسلے کے تیسرے خطابِ جمعہ میں بات خلیفہ چہارم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سیرت تک پہنچی۔ ''میثاق'' کے ادارۂ تحریر کے بزرگ رکن جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بڑی محنت سے اس خطاب کو مرتب کیا اور بعض تاریخی کتب کی مدد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت و سوانح کے بعد اہم واقعات کے اضافے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کا ایک نہایت دلکش مرقع تیار کیا، جسے میثاق کی دو اشاعتوں، اگست و ستمبر ۱۹۸۷ء میں شائع کیا گیا۔ محترم شیخ جمیل صاحب کی اس قابلِ قدر کاوش پر مزید نظر ثانی کرنے اور مناسب حک و اضافہ کے بعد اب اسے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کی سیرت پر مشتمل محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب ''شہیدِ مظلوم رضی اللہ عنہ'' کے عنوان سے ہماری مستقل مطبوعات میں شامل ہے، جس کی اثر انگیزی اور افادیت کا وسیع حلقے میں اعتراف کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتابچے کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ناظم نشر و اشاعت

۱۴ جون ۱۹۹۵ء

For more books visit :www.tanzeem.org

خطبۂ مسنونہ کی تلاوتِ آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

حضرات...... ہم ہر روز ہر نماز میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے ساتھ یہ دعا مانگتے ہیں کہ ﴿اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ﴾ ''(اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا''۔ سوال یہ ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن نے خود اس کا جواب دیا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ ربّ العالمین ہے:

﴿وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾﴾

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔''

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سب سے بلند مقام انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے۔ اس میں کسی کی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت جسے چاہا' اس مقام پر سرفراز فرما دیا۔ اس کے بعد اہل ایمان کے تین درجے متعین کیے گئے ہیں، جن کے نام قرآن نے صدّیقین' شہداء اور صالحین بیان کیے ہیں۔ انسان اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت میں ترقی کرتے کرتے ان مقامات کو حاصل کر سکتا ہے۔

مقامِ صدیقیتؓ اور مرتبۂ شہادت

آج اگرچہ میری گفتگو کا اصل موضوع تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مبارکہ ہے' لیکن ان کے مقام اور مرتبے کو سمجھنے کے لیے صدیقیتؓ اور شہادت کے مفہوم کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ از روئے قرآن انبیاء کے بعد انسانوں میں بلند ترین مراتب صدّیقین اور شہداء کے پاس ہیں اور ان میں بھی مقامِ صدیقیت مرتبۂ شہادت سے بلند تر ہے۔ ان دونوں مراتب کے مابین جو فرق ہے اس کا تعلق درحقیقت ایک مزاجی فرق سے ہے۔ علم نفسیات کی اصطلاح میں مزاجی ساخت کے اعتبار سے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ ''extrovert'' ہوتے ہیں' یعنی وہ لوگ جن کی توجہ خارج کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ اردو میں اس لیے ''بروں بین'' کی اصطلاح وضع کی گئی ہے' اور کچھ لوگ ''introvert'' ہوتے ہیں' یعنی وہ لوگ جن کی توجہ باطن کی طرف زیادہ ہوتی ہے' انہیں ہم ''دروں بین'' کہہ سکتے ہیں۔ کچھ انسانوں کے مزاجوں میں یہ فرق و تفاوت بہت نمایاں نظر آئے گا اور کہیں یہ فرق بہت معمولی نوعیت کا ہوتا ہے۔

مزاج اور افتادِ طبع کا فرق

پہلی بنیادی بات یہ جان لیجیے کہ انسانیت کا اعلیٰ جوہر دونوں مزاجوں کے افراد میں موجود ہوتا ہے لیکن مزاج اور افتادِ طبع کے اس فرق کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں دو مختلف سمتوں میں ظہور کرتی ہیں۔ یہ دو رُخ کیا ہیں' ان کو سمجھیے۔ دونوں یکساں طور پر ذہین و فطین ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک ذہانت و فطانت خارج کی طرف زیادہ متوجہؓ ہو گی اور دوسرے کی ذہانت و فطانت اپنے باطن کی طرف زیادہ متوجہؓ ہو گی۔ اس فرق کی وجہ سے ایسا محسوس ہو گا کہ ایک کو حقائق سے کوئی مناسبت نہیں' وہ خارج اور مظاہر کی دنیا ہی میں مگن ہے' جبکہ دوسرا باطنی حقائق پر توجہات کو مرکوز کیے بیٹھا ہے۔ دوسرا بنیادی فرق یہ ہو گا کہ حسّاس تو دونوں ہوں گے' لیکن ایک حساس ہو گا اپنی عزتِ نفس کے بارے میں کہ کوئی میری توہین تو نہیں کر گیا! کسی نے مجھے تحقیر کی نگاہ سے تو نہیں دیکھ لیا! کسی نے میری عزتِ نفس کو ٹھیس تو نہیں پہنچا دی! جبکہ اسی حساسیت کا ظہور دوسرے میں اس طرح ہو گا کہ مجھ سے کسی کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی! میں نے کسی کا دل تو نہیں دکھا دیا! کسی کو تکلیف میں دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے گا۔ بقولِ امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

دوسرے کو اپنے درد کا احساس تو خوب ہو رہا ہے' لیکن دوسروں کے درد کا احساس نہیں ہو رہا۔ اپنی ذات کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہے۔ گویا ع

''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں میں''

اُس کی نگاہ دوسروں کے احساسات کی بہ نسبت اپنی ذات کی طرف زیادہ ہے۔ حساسؔ دونوں ہوں گے...... نتیجہ کیا نکلے گا کہ ایک مزاج میں خلقِ خدا کے لیے شفقت' رحمت' رأفت ہو گی' جبکہ دوسرے کے مزاج میں شدت' سختی اور غصہ ہو گا۔ دوسری بات

یہ جان لیجیے کہ ایک کے غور وفکر کا انداز حکیمانہ اور فلسفیانہ ہوگا' اس کے قوائے ذہنی زیادہ چاق وچوبند ہوں گے' لہٰذا اس کی سوچ مرتب ہوگی اور کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچے گی' جبکہ دوسرے کے قوائے عملیہ زیادہ چاق وچوبند ہوں گے' وہ متحرک وفعال انسان ہو گا' بھاگ دوڑ میں آگے نکلے گا۔

آخری بات یہ ہے کہ شجاعت دونوں میں ہوگی' کیونکہ یہ بنیادی انسانی اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی انسانی جوہر دونوں میں مشترک طور پر ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں گے تو انسان نچلی سطح پر رہے گا' اوپر نہ اٹھ سکے گا۔ یعنی صالحیت سے درجہ شہادت اور صدیقیت کی طرف ترقی نہ کر سکے گا۔ البتہ ایک کی شجاعت ظاہر وباہر ہوگی' نمایاں نظر آئے گی۔ دوسرے کی شجاعت چھپی رہے گی' کبھی وقت آ گیا تو ظاہر ہو جائے گی۔

اُدھر کے سارے اوصاف جمع کر لیجیے' یہ لوگ جن کی توجہ خارج کی طرف زیادہ ہے' ان کا مزاج شہداء کا ہے۔ اور اِدھر کے سارے اوصاف جمع کر لیجیے' یہ مزاج صدیقین کا ہے۔ مختصر طور پر صحابہ کرامؓ میں سے ایک طرف رکھیے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو۔ یہ درجہ 'صدّیقین' کے نمایاں ترین افراد ہیں۔ یہ میں مَردوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ حضرت خدیجہؓ کا معاملہ یہ ہے کہ ایک تو وہؓ خاتون ہیں' دوسرے یہ کہ ہم مسلمانوں کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ان کی سیرت کے بارے میں بہت کم تفاصیل بیان کی جاتی ہیں۔ ورنہ میرے نزدیک مَردوں میں جس مقام پر حضرت ابوبکرؓ ہیں یعنی ''الصِدّیق الاکبر'' 'اسی طرح خواتین میں سے حضرت خدیجہؓ کا مقام یہ ہے کہ وہ ''الصِّدِیقة الکبریٰ'' ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ میں یہ دونوں بالکل متوازی شخصیتیں ہیں۔

اُدھر دوسری طرف حضرت حمزہ اور حضرت عمرؓ ہیں۔ درجہ شہداء میں یہ دونوں حضراتؓ نمایاں ترین ہیں۔ بنیادی انسانی جوہر ان چاروں اصحاب (ؓ) میں موجود ہے' لیکن فرق ملاحظہ کیجیے۔ حضرات حمزہ و عمرؓ کی اس طرف توجہ ہی نہیں ہوئی کہ غور کریں کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کیا کہہ رہے ہیں!...... مکہ کی چھوٹی سی بستی ہے' وہیں حضور ﷺ دعوت دے رہے ہیں۔ دن رات آپؐ اسی دھن میں ہیں۔ گھر گھر میں کشمکش ہو رہی ہے۔ لیکن ان دونوں کی کوئی توجہ ہی اس جانب نہیں ہے۔ پھر یہ کہ دونوں نہایت شجاع ہیں' فنونِ حرب میں ان کا نمایاں مقام ہے۔ ایک کا مشغلہ ہے سیر وشکار —— حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت کی کوئی جھلک اگر آپ کو صحابہ کرامؓ میں دیکھنی ہو تو وہ حضرت حمزہؓ ہیں اور ایک کے مزاج میں پہلوانی ہے۔ حضرت عمرؓ بڑے پہلوان تھے' باقاعدہ پہلوان۔ میں یہ لفظ صرف استعارہ کے طور پر استعمال نہیں کر رہا۔ عکاظ کے میلے جب ہوتے تھے تو ان میں حضرت عمرؓ باقاعدہ اپنی پہلوانی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے' چیلنج دے کر کشتیاں لڑتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی شخصیت کی اگر کوئی جھلک آپ نے صحابہ کرامؓ میں دیکھنی ہو تو وہ آپ کو حضرت عمرؓ میں نظر آئے گی۔ حضرت موسیٰؑ نے قبطی کے ایسا گھونسا رسید کیا تھا کہ وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔ دونوں کی دلچسپی انہی چیزوں کی طرف ہے۔ اپنے مشاغل میں مگن ہیں۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ مکہ میں جو کشمکش ہو رہی ہے تو یہ معاملہ کیا ہے! یہ دعوت کیا ہے! اس کے دلائل کیا ہیں! اسے قبول کریں یا رد کریں! یہ دونوں کا مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں حضرات جذباتی طور پر متاثر ہوئے اور جذباتی انداز میں اسلام قبول کیا۔ دونوں کے ایمان لانے کے واقعات اتنے مشہور ہیں کہ یہاں اعادے کی حاجت نہیں۔ جبکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمانؓ دونوں نہایت سلیم الفطرت' نہایت نرم طبیعت' لوگوں کے حق میں نہایت رحیم و شفیق' لوگوں کے کام آنے والے اور شرک سے پہلے ہی سے اجتناب کرنے والے تھے۔ نہ سیّئات انؓ کی زندگی میں' نہ منکرات انؓ کی زندگی میں' نہ شرک ان کی زندگی میں' نہ بت پرستی ان کی زندگی میں' نہ ان کی طبیعتوں میں سختی اور نہ غصہ۔ گویا دونوں بزرگوں میں نورِ فطرت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس پر نورِ وحی کا فیضان جب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے ہوا تو نورٌ علیٰ نور کا معاملہ ہو گیا۔ سونا تو پہلے سے تھا' لیکن خام تھا' اب وہ کٹھالی میں پڑ کر زرِ خالص بن گیا۔ یہ ہیں صدّیقین کی دو اعلیٰ ترین مثالیں۔

مزاجوں کے فرق کا جو تقابل اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے آیا ہے' اس سے مجھے امید ہے کہ آپ کو صحابہ کرامؓ کے مزاجوں اور سیرت و کردار کے بارے میں ایک باطنی بصیرت حاصل ہو گئی ہوگی۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے مزاجوں میں جو فعالیت تھی اس کا مظہر کس طور سے سامنے آیا! جب یہ دونوں حضرات ۶ نبوی ﷺ میں ایمان لائے تو اُس وقت مسلمان دبے ہوئے تھے' چھپ چھپ کر عبادت کر رہے تھے' اپنے ایمان کا اظہار کرنا ان کے لیے مشکل تھا' لیکن ان دونوںؓ کے ایمان لانے سے صورت حال بدل گئی۔ مسلمانوں کے اندر اعتماد پیدا ہو گیا' ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب مکہ کی گلیوں میں نعرے بھی لگ رہے ہیں' بیت اللہ کے صحن میں آ کر برملا نماز بھی ادا کی جا رہی ہے۔ یہ ساری صورت حال جو بدلی ہے تو اس میں ان دونوں حضرات کے ایمان لانے کو فیصلہ کن دخل تھا۔

''شہادت'' اور کارِ رسالت

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے تین بنیادی امور کو سمجھ لیجیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ شہید' شاہد' شہادت اور شہداء کے الفاظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ کارِ رسالت کے ساتھ ان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا وہ شہید ہے' لیکن قرآن مجید میں اس مفہوم میں یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ صرف ایک مقام پر یہ مفہوم لینے کی گنجائش ہے۔ قرآن میں جب بھی شہید' شاہد یا شہادت کے الفاظ آتے ہیں تو اکثر ان کا استعمال کارِ رسالت کی ادائیگی کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی حق کی گواہی دینا' لوگوں پر حق کو اس طرح کھول کر بیان کر دینا کہ ان کے پاس کوئی عذر نہ رہے' اتمامِ حجت کر دینا۔ اس معنی میں اس امت کو ''شُھَدَآءَ عَلَی النَّاس'' قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۱﴾

(آیت:۱۴۲)

''اور ہم نے اس طرح تمہیں ایک بہترین اور درمیانی اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور اللہ کے رسول (ﷺ) تم پر گواہ بن جائیں''۔

یہی مضمون سورۃ الحج کے آخر میں عکسی ترتیب سے آیا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۵﴾ (آیت:۷۸)۔ اسی معنی میں یہ لفظ سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں آیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ

اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾﴾ اور اسی معنی میں یہ لفظ سورۃ المزمّل کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿ؕ۱۵﴾﴾

دوسری بات یہ کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر مرتبہ شہادت حاصل کرنا ایک الگ معاملہ ہے۔ مقتول فی سبیل اللہ کو شہید اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اُس نے حق کی خاطر جان دے کر گویا دینِ حق کی گواہی اور شہادت دینے کا حق ادا کر دیا۔ تاہم جو شخص مزاجاً شہید یعنی دین کی دعوت اور اقامت کے کام میں فعالّ ہو اور اللہ کی راہ میں قتل بھی ہو جائے تو یہ نورٌ علیٰ نور والا معاملہ ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مزاجاً شہید ہو‘ لیکن اسے طبعی موت نصیب ہو۔ ایک ایسا شخص جو کارِ رسالت کی ادائیگی میں نہایت چاق و چوبند ہے‘ تبلیغِ دین میں نبی اکرم ﷺ کا دست و بازو بنا ہوا ہے‘ بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ دین کے کام میں لگا ہوا ہے‘ پوری قوت کے ساتھ اُس نے دین کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ گویا یہ مزاجاً تو شہداء میں سے ہے‘ چاہے اسے اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا نصیب ہو یا نہ ہو۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ حضرت خالد بن ولید ؓ نے کتنی جنگیں لڑیں! کتنے زخم کھائے! لیکن اللہ کی راہ میں قتل ہونا‘ ان کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس کے برعکس ایک مثال حضرت عثمان ؓ کی ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کا مزاج صدّیقین کا تھا‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کی موت بھی عطا فرمائی۔ تو اس طرح بھی ان میں گویا دو نور جمع ہو گئے۔ آپؓ کو ’’ذُوالنورَین‘‘ اصلاً تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی دو لختِ جگر یکے بعد دیگرے انؓ کے حبالۂ عقد میں آئیں‘ لیکن آپؓ کا ذُوالنورین ہونا دیگر بہت سے پہلوؤں کے باعث بھی تھا۔ حضرت ابوبکر ؓ مزاجاً صدیقؓ تھے‘ آپؓ کو طبعی موت آئی۔ تاہم مقام و مرتبہ کے اعتبار سے وہ شہداء سے بلند ہیں‘ اس لیے کہ وہ مرتبۂ صدیقیت پر فائز ہیں۔ حاصلِ کلام کے طور پر یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ لفظ شہادت کا بڑا گہرا تعلق کارِ رسالت اور تبلیغِ دین کے ساتھ ہے۔

ایک منفرد مگر متوازن مزاج

تیسری بات یہ کہ شاذ ہستیاں ایسی بھی ہیں جن میں دروں بینی اور بروں بینی کی صلاحیتیں کمال توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ جدید علمِ نفسیات کی اصطلاح میں ایسی ہستیوں کو ’’ambivert‘‘ کہا جاتا ہے۔ ان کے اندر حسّاسیت بھی دونوں طرح کی ہوتی ہے‘ اپنی عزّتِ نفس کا بھی پورا احساس ہوتا ہے اور دوسروں کے دکھ درد کا احساس بھی کامل ہوتا ہے۔ ان کے اندر شجاعت بھی دونوں طرح کی جمع ہو جاتی ہیں‘ وہ شجاعت بھی جو قوتِ ارادی کی شکل میں انسان کے اندر ہوتی ہے...... جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ((لَیۡسَ الشَّدِیۡدُ بِالصُّرُعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیۡدُ الَّذِیۡ یَمۡلِکُ نَفۡسَہٗ عِنۡدَ الۡغَضَبِ))(۱) ’’پہلوانی کسی کو پچھاڑ لینے کا نام نہیں ہے۔ اصل پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکے‘‘...... اور وہ شجاعت بھی کہ جو ظاہر و باہر ہو‘ جس کا مشاہدہ لوگ سر کی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی توجہ خارج کی طرف بھی ہوتی ہے اور باطن کی طرف بھی‘ مظاہر میں بھی ان کی دلچسپیاں یکساں ہوتی ہیں اور حقائق میں بھی۔ یہ مزاج آپ کو بہت شاذ اور بہت مشکل سے ملے گا۔

نبی اکرم ﷺ کا امتیازی مقام

میرے نزدیک جماعتِ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام میں اکمل اور متوازن شخصیت‘ جس میں یہ دونوں مزاج کمال توازن کے ساتھ اپنی اعلیٰ ترین شکل میں موجود تھے‘ صرف اور صرف جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدس ہے۔ پوری نسلِ انسانی میں اس طرح کی جامع ہستی اور کوئی نہیں ملے گی‘ اس طرح کا جامع الصفات فرد کہیں نظر نہیں آئے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ بنیاد ہے جو ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بیان کی ہے۔ وہ نسلِ انسانی کے عظیم ترین سو افراد کی فہرست میں پہلے نمبر پر جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو لایا ہے۔ اس کی دلیل وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

> *"He was the only man in history who was superemely successful on both the religious and secular levels."*

وہ کہتا ہے کہ تاریخِ انسانی میں صرف اور صرف محمد (ﷺ) انسانی زندگی کے دونوں میدانوں میں کامیاب ترین شخصیت ہیں۔ ایک میدان مذہب کا ہے‘ اخلاق کا ہے‘ حسنِ معاملات کا ہے‘ عبادت و تقویٰ کا ہے‘ خیر کا ہے‘ روحانیت کا ہے‘ جبکہ دوسرا میدان سیاست کا ہے‘ تمدّن کا ہے‘ حکومت کا ہے‘ ریاست کا ہے‘ جنگ و صلح کا ہے‘ عدل و انصاف کا ہے‘ تعزیرات و حدود کا ہے۔ آج کے دَور میں انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان سمجھے جاتے ہیں: ایک انفرادی زندگی جس کا تعلق مذہب سے ہے اور ایک اجتماعی زندگی جس کا تعلق ریاست اور اس کے جملہ شعبوں سے ہے۔ ڈاکٹر ہارٹ کے اس ایک جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور اس میں اظہارِ حقیقت کی کتنی جرأت ہے کہ عیسائی ہونے کے باوجود دنیا کے عظیم ترین اشخاص میں وہ سرِفہرست لایا ہے جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو۔ میں اس کی ذہانت اور دیانت کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نے نہ صرف حضور ﷺ کی شانِ کاملیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک حاصل کیا بلکہ اس کا اظہار کرنے میں بھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

’’صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا‘‘ اور ’’رَسُوۡلًا نَّبِیًّا‘‘

انبیاء و رسل علیہم السلام کی مقدس جماعت میں بھی آپ دیکھیں گے کہ بعض کا مزاج شہداء کا ہے اور بعض صدّیقین کا مزاج رکھتے ہیں۔ ذہن میں رکھیے کہ شہید سے یہاں میری مراد مقتول فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ میری پوری گفتگو انسانی مزاج کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ بعض کے مزاج میں وہ کیفیات ہوں گی جو مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے مزاج میں پاتے ہیں۔ بعض انبیاء و رسلؑ کے مزاج میں آپ کو وہ کیفیات نظر آئیں گی جو مثلاً آپ حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما میں دیکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر نبیوں کے ناموں کے گلدستے آپ کو ملیں گے۔ سورۂ مریم میں بھی ایک ایسا ہی گلدستہ ہے۔ وہاں دو نبیوں کی تعریف ان الفاظ میں آئی ہے: ’’صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا‘‘۔ یہ ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام‘ ان دونوں پر صدّیقیت کا رنگ غالب ہے۔ جبکہ دو کے متعلق فرمایا: ’’رَسُوۡلًا نَّبِیًّا‘‘۔ یہ ہیں حضرت موسیٰ

اور حضرت اسماعیل علیہما السلام۔ وہی جن کا ذکر میں کر چکا ہوں کہ اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نقشہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں دیکھنا ہو تو اس کی جھلک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نقشہ دیکھنا ہو تو اس کا عکس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق آپ نے پڑھا ہوگا کہ کنعان (فلسطین) سے چل کر کئی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے سے ملنے مکہ مکرمہ تشریف لائے، لیکن بیٹا شکار کے لیے نکلا ہوا ہے...... کئی دن تک منتظر رہے، مگر بیٹا آیا ہی نہیں۔ کچھ پیغام چھوڑ کر بغیر ملے واپس چلے گئے۔ ایسے ہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ تیر و کمان اور تلوار لے کر نکل گئے اور صحرا کے اندر کئی کئی دن شکار میں مشغول ہیں۔ یہ ان کا ذوق تھا۔ یہ بات میں عرض کر چکا ہوں کہ مفہوم کے اعتبار سے کارِ رسالت کی مناسبت لفظِ شہادت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اپنے مزاج کے اعتبار سے شہداء کی صف میں آتے ہیں، لہٰذا ان کا ذکر ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا'' کے الفاظ سے ہوا۔

یہیں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ نبوت و رسالت جو منعم علیہم کے مراتب کا بلند ترین رُتبہ اور درجہ ہے، وہ خواتین کے لیے نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے صرف مَردوں کے لیے رکھی ہے۔ خواتین کے لیے اعلیٰ ترین درجہ صدّیقیت ہے۔ چنانچہ حضرت مریم کے لیے قرآن میں یہی لفظ آیا ہے: ''وَ اُمُّهٗ صِدِّیۡقَةٌ'' یعنی حضرت عیسیٰؑ کی والدہ صدّیقہ تھیں۔

علیؓ مرتضیٰؓ ...... حضرت عیسیٰؑ سے مشابہت

اب آیئے حضرت علی رضی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ آپؓ کے مزاج کی ساخت، آپؓ کی طبیعت، اور آپؓ کی سیرت کے عناصر ترکیبی کو سمجھیے اور آپؓ کی عظمت کو پہچانیے۔ آج کی اس تقریر کے لیے ''مثیلِ عیسیٰؑ - علی مرتضیٰؓ'' کا عنوان دیکھ کر بہت سے لوگ چونکے ہوں گے کہ یہ لفظ تو حضرت علیؓ کے غالی عقیدت مندوں نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا، یہ تم کہاں سے لے آئے! تو سن لیجیے، یہ لفظ میں نے اس حدیث سے لیا ہے جس کے راوی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبلؒ اپنی مسند میں لائے ہیں۔ اس کے علاوہ مستدرک حاکم اور کامل ابن عدی میں بھی یہ حدیث موجود ہے، اور صاحب مشکوٰۃ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ خود اہل تشیع کی مستند کتاب ''نہج البلاغۃ'' میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول قریباً انہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ گویا اس حدیث کی صحت پر اہل سنّت اور اہل تشیع دونوں متفق ہیں:

عن عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ لِیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فِیۡکَ مَثَلٌ مِنۡ عِیۡسٰی اَبۡغَضَتۡهُ الۡیَهُوۡدُ حَتّٰی بَهَتُوۡا اُمَّهٗ وَاَحَبَّتۡهُ النَّصَارٰی حَتّٰی اَنۡزَلُوۡهُ بِالۡمَنۡزِلَةِ الَّتِیۡ لَیۡسَتۡ لَهٗ)). ثُمَّ قَالَ: یَهۡلِکُ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفۡرِطٌ یُقَرِّظُنِیۡ بِمَا لَیۡسَ فِیَّ وَمُبۡغِضٌ یَحۡمِلُهٗ شَنَاٰنِیۡ عَلٰی اَنۡ یَبۡهَتَنِیۡ [1]

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ ان سے یہود نے بغض رکھا حتیٰ کہ ان کی والدہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی۔ اور نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی، حتیٰ کہ انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جو ان کا مقام نہیں''۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میرے بارے میں بھی دو افراد ہلاک ہوں گے۔ ایک میری محبت میں افراط کرنے والا کہ مجھ میں وہ اوصافِ گنوائے جو مجھ میں نہیں، اور ایک مجھ سے بغض رکھنے والا کہ وہ میری دشمنی میں یہاں تک بڑھ جائے کہ مجھ پر بہتان لگائے''۔

وہ مشابہت کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس پہلو سے مثیلِ عیسیٰؑ ہیں؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس طرح یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انتہائی بغض رکھا، یہاں تک کہ انہوں نے ان کی والدہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی [1] اسی طرح کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھیں گے۔

دوسری انتہا کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام سے انتہائی محبت کی اور انہیں اس منزل اور مرتبہ تک پہنچا دیا جو انؑ کا مقام نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا صلبی بیٹا بنا دیا۔ وہ انہیں محض استعارہ کے طور پر اللہ کا بیٹا نہیں کہتے، اسی لیے وہ ''ابن'' کے بجائے ''ولد'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ''اقانیم ثلاثہ'' میں سے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں اس انتہا تک پہنچ جائیں گے کہ ان کا درجہ اللہ کے برابر کر دیں گے۔

آنحضور ﷺ کے اس ارشاد کی وضاحت میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے بارے میں بھی دو اشخاص ہلاک ہوں گے۔ یعنی میرے معاملے میں افراط و تفریط کے باعث ہلاکت، بربادی، تباہی اور ضلالت کی انتہا کو پہنچ جائیں گے۔ ایک وہ ہلاک و برباد ہوگا جو میری محبت میں افراط کو پہنچ جائے گا اور میرے لیے وہ اوصاف گنوائے گا جو میرے اندر نہیں ہیں۔ دوسرا وہ شخص ہلاک ہوگا جو مجھ سے عداوت، دشمنی، عناد رکھے گا اور میری دشمنی اسے یہاں تک پہنچائے گی کہ وہ مجھ پر بہتان لگائے گا، مجھ سے وہ جرائم منسوب کرے گا جن سے اللہ نے مجھے پاک صاف رکھا ہے۔ یہ ہے وہ حدیث جس کے حوالہ سے میں نے اپنی آج کی گفتگو کا عنوان ''مثیلِ عیسیٰؑ - علی مرتضیٰؓ'' اخذ کیا ہے۔

حدیث کا پیش منظر

اب حضور ﷺ کے اس قول مبارک کی شرح اور اس کی وہ توضیح جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی، دونوں کو تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھیے کہ اس کا عملی ظہور کس شکل میں ہوا!

سبائی فتنہ

ایک انتہا وہ ہے جس کا بانی عبداللہ بن سبا ہے۔ یہ شخص علاقہ یمن کا رہنے والا ایک یہودی عالم تھا، جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بالکل ابتدائی دورِ خلافت میں اسلام قبول کیا تھا۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ اس کا قبولِ اسلام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا۔ وہ اسلام میں داخل ہو کر اندر ہی اندر ایک طرف توحید و رسالت کی بنیادوں کو منہدم کرنا چاہتا تھا، دوسری طرف اس کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق پیدا کر کے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے اور ع

''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا''

کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے آگے بند باندھے اور اس طرح اسلام کو جو قوت و شوکت حاصل ہو رہی تھی‘ اسے پاش پاش کر دے۔ خلافتِ فاروقی کے قریباً دس سالوں میں اسلامی دعوت اور عسکری فتوحات کا دائرہ اتنی تیزی سے وسیع ہوا کہ وقت کی دو عظیم ترین مملکتوں یعنی روم و فارس کے بیشتر علاقے اسلام کے زیر اقتدار آ گئے۔ مجوسیوں کی سازش کے نتیجے میں فاروق اعظم حضرت عمرؓ شہید کر دیے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں داخلی انتشار پیدا ہو گا‘ ان کے اتحاد میں نقب لگ جائے گی‘ ان کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور اسلام کی فتوحات کی یلغار رک جائے گی۔ لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے زمامِ خلافت سنبھال کر حالات پر پوری طرح قابو پا لیا اور مملکت کے داخلی استحکام میں کوئی رخنہ پیدا ہوا نہ کوئی خلل واقع ہوا۔ مفتوحہ علاقوں میں البتہ چند شورشیں اور بغاوتیں اٹھیں لیکن ان کو حضرت عثمانؓ نے نہ صرف فرو کر دیا بلکہ فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ فارس (ایران) کا وہ علاقہ جو عہدِ فاروقی میں فتح ہونے سے باقی رہ گیا تھا‘ وہ بھی اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا اور نبی اکرمﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق خلافتِ عثمانی میں کسریٰ کی سطوت اور سلطنت کے پرخچے اڑنے کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس دوران مفتوحہ ممالک کے بے شمار لوگ اسلام کو دینِ حق اور وسیلۂ نجات جان کر اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت کا لاوا پک رہا تھا اور وہ اسی ارادے اور منصوبے کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہوئے تھے کہ موقع ملتے ہی کوئی شورش اور فتنہ کھڑا کر کے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔

ابنِ سبا اور پولوس: ایک عجیب مماثلت

اس تناظر میں عبداللہ بن سبا آگے بڑھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جتنا سازشی ذہن یہودی قوم کا ہے اور اس ضمن میں جو بے پناہ مہارت اس قوم کو حاصل ہے اس کا کوئی دوسری قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سازشی منصوبہ بندی میں اس قوم کو کمال حاصل ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عیسیٰؑ جو دینِ حق لے کر تشریف لائے تھے وہ خالص دینِ توحید تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہود کے ان فاسد عقائد‘ بدعات اور اعمالِ بد پر شدید تنقیدیں فرمائیں جو ان کے دنیا پرست علماء نے دینِ خالص کے چشمۂ صافی میں دین ہی کے نام سے داخل کر دی تھیں۔ یہود اس کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کے عالموں‘ پیشواؤں اور عوام نے حضرت عیسیٰؑ کو جھوٹا مدعیٔ نبوت‘ جادوگر اور شعبدہ باز قرار دیا اور یہودی شریعت کے مطابق مرتد اور واجب القتل ٹھہرا کر اپنی عدالت میں مقدمہ چلانے کے بعد انہیں صلیب کے ذریعہ سے سزائے موت دینے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ پھر اُس وقت کی برسرِ اقتدار رومی حکومت کے گورنر سے فیصلہ کے نفاذ کی منظوری بھی حاصل کر لی اور اپنے تئیں حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھوا کر دم لیا‘ جبکہ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو جسمانی طور پر آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ آپؑ قیامت کے قریب دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپؑ ہی کے ہاتھوں یہود کا قتل عام ہو گا۔ اس طرح وہ اس کلی خاتمے کے عذاب کا مزہ چکھیں گے جو رسولوں کا انکار کرنے والی قوموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے۔

یہود اپنی دانست میں حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھوا کر بے فکر ہو گئے تھے کہ انہوں نے علمی و عملی توحیدِ خالص کے چشمۂ صافی کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ لیکن مسیحؑ کے مخلص اور صادق العہد حواریوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی آنجنابؑ کی لائی ہوئی ہدایت کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور جب ان کی مخلصانہ جدّوجہد برگ و بار لانے لگی اور دعوتِ حق کے غلبہ کے آثار ہویدا ہونے لگے تو یہودیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دینِ خالص کی مقبولیت اور اس کی توسیع کا راستہ روکنے کے لیے ساؤل نام کا ایک مشہور یہودی عالم میدان میں آیا۔ یہ وہ شخص تھا جو دینِ عیسوی کا انتہائی دشمن تھا اور اس کی شدید ترین مخالفت میں پیش پیش رہتا تھا‘ سچی عیسائیت قبول کرنے والوں پر خود بھی ظلم کرتا اور دوسروں سے بھی کراتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ شدید مخالفت اور مظالم کے باوجود دینِ عیسوی پھیل رہا ہے تو اس نے پینترا بدلا اور اپنے ایک من گھڑت مکاشفے یا مشاہدے کا اعلان کر کے عیسائیت قبول کر لی[1]۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ اس مکاشفہ میں حضرت عیسیٰؑ نے مجھے اپنا نام بدلنے کی بھی ہدایت کی ہے‘ چنانچہ اب میرا نام پولوس ہو گا۔ یہی شخص اب عیسائی دنیا میں سینٹ (ولی) پولوس یا سینٹ پال کے نام سے مشہور ہے۔

اس یہودی زادے نے دینِ عیسوی میں تحریفات پر ہی بس نہیں کیا بلکہ خالص دینِ توحید کو مسخ کر کے اس میں عریاں ترین اور بدترین شرک شامل کر دیا۔ یہ پال ہی ہے جس نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا باقاعدہ ''صلبی بیٹا'' قرار دے کر آپؑ کو الوہیت میں شریک ٹھہرایا اور ''روح القدس'' کو‘ جس سے بعض فرقے حضرت مریمؑ اور بعض حضرت جبرئیلؑ مراد لیتے ہیں ''اقانیمِ ثلاثہ'' میں شامل کر کے تثلیث کا عقیدہ گھڑا۔ اسی پال نے شریعتِ موسویؑ کو منسوخ قرار دیا‘ جبکہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول موجودہ اناجیل میں اب بھی موجود ہے کہ ''یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو منسوخ کرنے آیا ہوں''۔ اسی پال نے ''کفارہ'' کا عقیدہ ایجاد کیا کہ جو بھی حضرت مسیحؑ پر (اس کے عقیدے کے مطابق) ایمان لائے گا اس کے گناہ آخرت میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے‘ کیونکہ اپنے بندوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خدا نے اپنا بیٹا صلیب پر چڑھوا دیا۔ منصف مزاج عیسائی محققین برملا اعتراف کرتے ہیں کہ موجودہ عیسائیت کا کوئی تعلق حضرت عیسیٰؑ کے لائے ہوئے دین سے نہیں ہے‘ بلکہ یہ خالص پال کی ایجاد ہے۔

عبداللہ بن سبا کی سازش پال (پولوس) کی سازش سے کم نہیں تھی۔ پال نے سچے دینِ عیسوی میں جو تحریف و تخریب کی تھی اس سے عبداللہ بن سبا کے سازشی ذہن نے یہ سبق لیا کہ توحیدِ خالص کی حامل اُمت کو گمراہ کرنے‘ اسے راہِ حق سے ہٹانے اور غیر ضروری مسائل میں الجھانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اُمت کی نظر میں جو مقدس اور محبوب ترین شخصیتیں ہوں‘ ان کے متعلق محبت و عقیدت میں غلو اور افراط و تفریط کے جذبات کو ابھارا جائے اور ان میں سے بعض کو بعض پر غیر ضروری فضیلت دینے کا حربہ استعمال کر کے اختلاف و افتراق پیدا کیا جائے۔ خلافتِ عثمانیؓ کے ابتدائی دور میں جبکہ وہ منافقانہ طور پر اسلام لا چکا تھا‘ اس نے مدینہ ہی میں اس کام کی ابتدا کر دی تھی‘ لیکن اس نے اپنی ذہانت سے اس وقت اندازہ لگا لیا کہ صرف یہاں ہی نہیں بلکہ پورے حجاز میں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اس علاقہ میں دینی شعور نہایت گہرا ہے اور دین کے ایسے پاسبان موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کے مذموم مقاصد میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا اس نے مفتوحہ علاقوں کے اہم شہروں کا دورہ شروع کیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ان علاقوں میں جہاں بہت سے لوگ اسلام کی حقانیت اور صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار

For more books visit :www.tanzeem.org

سے مسخر اور مطمئن ہو کر صدقِ دل سے ایمان لائے تھے‘ وہاں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اسلامی انقلاب کی طوفانی یلغار اور توسیع سے مرعوب ہو کر مسلمان ہوئے تھے اور ایمان ان کے دلوں میں اترا نہ تھا۔ یہ لوگ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ ابن سبا نے ایسے ہی لوگوں میں سے اپنے ڈھب کے افراد کو چُن چُن کر خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے شام میں کوشش کی لیکن وہاں کوئی شخص اس کے جھانسے میں نہیں آیا۔ پھر اس نے مصر‘ بصرہ اور خاص طور پر کوفہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ ان مقامات پر اسے اپنے ڈھنگ کے کچھ منافق اور کچھ جاہل اور ناتربیت یافتہ لوگ مل گئے۔ ایسے سیدھے سادھے لوگ بھی خاصی تعداد میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے جن کے خمیر میں شخصیت پرستی رچی بسی تھی۔ اس طرح اس نے ایسے لوگوں کا ایک گروہ تیار کر لیا جو اس کی مفسدانہ مہم میں اس کے مددگار بن گئے۔

ابن سبا کی تکنیک

یہ ساری ریشہ دوانیاں یہ یہودی زادہ بڑی رازداری‘ ہوشیاری‘ اخفاء اور مکر و فریب سے اس طرح انجام دے رہا تھا جس طرح ہمارے دور میں زیر زمین سبوتاژ کی خفیہ تحریکیں چلتی ہیں۔ وہ خود اور اس کے قریبی ساتھی خفیہ طور پر مختلف شہروں میں آتے جاتے رہتے۔ کوفہ کے عمال کی مصر میں اور مصر کے عُمال کی کوفہ میں برائیاں کرتے اور لوگوں کو باور کراتے کہ یہ عُمال اپنے اختیارات سے ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں اور پُرتعیش زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ پھر یہ خرابیاں خلیفۂ وقت حضرت عثمان ؓ کے کھاتے میں ڈالی جاتی تھیں۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے کا تصور کیجیے جبکہ نہ اخبارات تھے‘ نہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن‘ اور نہ ہی ڈاک کا معقول انتظام۔ لوگوں کے پاس دوسرے شہروں کے حالات معلوم کرنے کے ذرائع مفقود تھے۔ آج اِس ترقی یافتہ دور میں بھی‘ جبکہ ذرائع ابلاغ اور وسائل معلومات وسیع تر ہو چکے ہیں‘ اکثر و بیشتر لاہور جیسے شہر میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں صحیح خبر نہیں پہنچتی‘ اس میں دسیوں افسانے شامل ہو جاتے ہیں۔

پھر اس عیار یہودی نے مذہبی اور سیاسی محاذ ایک ساتھ کھول رکھے تھے۔ کہیں وہ یہ شوشہ چھوڑتا کہ حضور ﷺ سب سے افضل ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو دنیا میں واپس آئیں اور حضور ﷺ نہ آئیں؟ وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتا: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ﴾ (القصص:۸۵)۔ اس آیت کا ترجمہ شیخ الہندؒ نے اس طرح کیا ہے: (اے نبی) جس (اللہ) نے حکم بھیجا تجھ کو قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ‘‘۔ تمام متقدمین و متاخرین مفسروں نے یہاں ’’رَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ‘‘ سے ہجرت کے بعد حضور ﷺ کا بطورِ فاتح مکہ واپس لوٹنا مراد لیا ہے۔ اس آیت میں وفات کے بعد حضور ﷺ کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کا ادنیٰ سا اشارہ بھی موجود نہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے زیر اثر نادانوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں نے قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف اس کی بات مان لی ہے تو اس نے محبت و عقیدت کا رخ حضرت علی ؓ کی طرف پھیرنے کے لیے اپنے حالی موالیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہر نبی کا ایک ’’وصی‘‘ ہوتا ہے جو نبی کا خصوصی قرابت دار اور تربیت یافتہ ہوتا ہے‘ جس کو نبی خاص وصیتیں اور اہم ہدایات خفیہ طور پر دیتا ہے۔ اور علی ؓ محمد ﷺ کے وصی ہیں۔ پھر یہ کہ جس طرح محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں‘ اسی طرح علی ؓ بھی خاتم الاوصیاء ہیں۔ خلافت کے حقیقی حقدار بھی علیؓ ہیں‘ لہٰذا پہلے دو خلفاء غاصب تھے۔

پھر اس نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی ؓ کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنی شروع کی......اس نے اہم شہروں میں اپنے داعی اور ایجنٹ پھیلا دیے جو یہ پراپیگنڈا کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کو معزول کر کے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا جائے۔ قریباً دس سال کی یہ مذموم سازش اور شر و فساد کی یہ خفیہ تحریک بہر حال رنگ لائی اور ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو سبائیوں کے ہاتھوں حضرت عثمان غنی ذوالنورین ؓ انتہائی مظلومانہ طریق پر شہید کر دیے گئے۔ آپؓ نے باغیوں کی سرکوبی کے جملہ وسائل رکھنے کے باوجود‘ اپنی جان کے تحفظ کے لیے ان باغیوں اور منافقوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے اور تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی‘ اس لیے کہ ان سبائیوں کے پاس کلمہ طیبہ کی ڈھال موجود تھی۔

حضرت عثمان ؓ کو شہید کرنے کے بعد ان سبائیوں نے حضرت علی ؓ کو گھیر لیا کہ آپ ؓ ان سے اور عامۃ المسلمین سے خلافت کی بیعت لے لیں‘ لیکن حضرت علیؓ نے اس سے انکار کر دیا۔ تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ ادھر یہ سبائی آپ ؓ کے ساتھ بھی گستاخی کرنے لگے۔ دوسری طرف اہل مدینہ نے بھی حضرت علی ؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ اُمت بغیر خلیفہ کے رہ گئی ہے۔ اب آپ ؓ کے سوا اُمتِ مسلمہ میں کوئی دوسری ایسی شخصیت نہیں ہے جو اس عظیم منصب کے لیے قابل ترجیح ہو۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اصرار پر‘ جن میں اصحابِ رسول ﷺ کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل تھی‘ حضرت علی ؓ نے بیعتِ خلافت لے لی۔

محبت میں غلو: سبائی سازش کا شاخسانہ

اب تک میں نے عبداللہ بن سبا کی ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے دین کے اس دشمن نے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق پیدا کرنے کے لیے کی تھیں۔ اس نے عراق کے لوگوں میں‘ جو طویل عرصہ تک کسریٰ کے ماتحت رہے تھے اور ایران کے اصل باشندوں میں سے جو لوگ اسلام لے آئے تھے‘ ان کے اندر خاص طور پر کام کر کے ان کی محبت و عقیدت کا رخ بڑی عیاری اور ہوشیاری سے حضرت علیؓ کی طرف پھیر دیا۔ ان لوگوں میں چونکہ صدیوں سے شخصیت پرستی رچی بسی تھی اور یہ خاندانی بادشاہت و حکومت کے خوگر تھے لہٰذا عبداللہ بن سبا کو اس کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ علیؓ خدا ہیں‘ ان کے قالب میں روحِ خداوندی ہے۔ حضرت علی ؓ نے جب مدینۃ النبیؐ کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ بنا لیا تو یہ علاقہ اس گروہ کی سرگرمیوں کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہوا۔

حضرت علیؓ کا اقدام

اہل سنت اور اہل تشیع کی اکثر مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ جب عبداللہ بن سبا کی ان گمراہ کن جسارتوں کی خبر حضرت علی ؓ تک پہنچی تو انہوں نے اسے بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ کیا تو یہ باتیں کہتا ہے؟ اس نے اقرار کیا اور حضرت علی ؓ کے سامنے کھڑے ہو کر برملا کہا کہ میرے دل میں القا ہوا ہے کہ ’’اِنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ‘‘ (بے شک آپ ہی اللہ ہیں)...... حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ اگر تم اس کفر سے توبہ نہیں کرو گے تو زندہ آگ میں جلوا دوں گا۔ اس نے کہا کہ آپ ہمارے خدا

ہیں‘ خدا امتحان لیتا ہی ہے‘ آپ بھی ہمارا امتحان لے رہے ہیں‘ ہم اس امتحان میں ثابت قدم رہیں گے۔ اس لعین نے سادہ لوح لوگوں پر اس طرح یہ نشہ طاری کر دیا تھا کہ ستر آدمی اس موقع پر اس کے ساتھ تھے اور اس عقیدۂ باطلہ میں اس کے ہم نوا تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو توبہ کے لیے تین دن کی مہلت دی اور قید کرا دیا۔ لیکن ابن سبا اور اس کے ساتھی باز نہ آئے اور انہوں نے توبہ سے انکار کر دیا۔ آخر کار حضرت علیؓ نے ایک خندق کھدوائی‘ اس میں آگ جلوائی اور ان سب کو آگ اور اس کے دھوئیں سے مار دیا[1]۔ حضرت علیؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے اس بدترین شرک کی جو بدترین سزا ہونی چاہیے تھی وہ نافذ کی۔ یہ شرک ہی نہیں بلکہ کھلم کھلا ارتداد تھا کیونکہ وہ سب مسلمان ہونے کے مدعی تھے اور خود کو مسلمان کہتے ہوئے کسی انسان کو خدا مان لینے سے بڑا ارتداد اور کون سا ہوگا۔ بعض روایات کے مطابق ان جلائے جانے والوں میں عبداللہ بن سبا شامل نہیں تھا۔

ابن سبا کی شخصیت

میری اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ عبداللہ بن سبا نہایت غالی اور کٹر یہودی تھا اور اس نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اسی طرح اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا جیسے پولوس نے مسیحیت کا۔ اُس نے حضرت مسیحؑ کو ’’خدا کا بیٹا‘‘ بنایا تھا اور اِس نے حضرت علیؓ کو ’’خدا‘‘ بنا دیا۔ دنیا میں آج بھی چند فرقے حضرت علیؓ کی اُلوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کے آغا خانیوں کے علاوہ شام اور لبنان میں ’’نصیری‘‘ نام کا ایک فرقہ حضرت علیؓ کو آج بھی خدا مانتا ہے۔

عبداللہ بن سبا کے بارے میں آج کل ایک گروہ کے بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ تاریخ میں اس نام کی کوئی حقیقی شخصیت موجود نہیں تھی‘ یہ محض افسانوی اور مفروضہ شخصیت ہے۔ حالانکہ اس شخص کے تذکرے تاریخ اسلامی کی متعدد مستند کتابوں میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ جس طرح اہل سنت کے نزدیک احادیث کی معتبر ترین کتاب صحیح بخاری ہے اسی طرح اثنا عشری امامیہ اہل تشیع کے نزدیک ان کی کتبِ حدیث میں سب سے زیادہ مستند و معتبر ابو جعفر یعقوب کلینی رازی کی کتاب ’’الجامع الکافی‘‘ ہے اور اہل تشیع کے ہاں احادیث کے راویوں کے بارے میں ’’اسماء الرجال‘‘ کی سب سے زیادہ قابل اعتماد کتاب ابو عمر الکشی کی ’’رجال کشی‘‘ ہے اس کتاب کا پورا نام ’’معرفۃ اخبار الرجال‘‘ ہے۔ اس کتاب میں حضرت زین العابدین‘ حضرت محمد باقر[1] اور حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے متعدد اقوال موجود ہیں جن میں اس شخص عبداللہ بن سبا کا ذکر ہے۔ رجال کشی میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کا یہ قول اسناد کے ساتھ موجود ہے:

> ’’خدا ابن سبا پر لعنت کرے۔ اس نے حضرت علیؓ کے متعلق ربوبیت کا دعویٰ کیا‘ خدا کی قسم امیر المومنین اللہ کے بندے تھے۔ ہلاکت ہو اس پر جو ہم پر جھوٹ باندھتا ہے اور لوگ ہمارے بارے میں وہ کچھ کہتے ہیں جو ہم اپنے بارے میں نہیں کہتے۔ ہم بارگاہِ الٰہی میں ان لوگوں سے اپنی براءت کا اعلان کرتے ہیں۔‘‘

اسی طرح رجال کشی میں حضرت زین العابدین رحمہ اللہ سے روایت ہے:

> ’’جس نے حضرت علیؓ پر افترا کیا اس پر اللہ لعنت کرے۔ جب عبداللہ بن سبا کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس نے ایک بہت بڑا دعویٰ کیا‘ اللہ اس پر لعنت کرے۔‘‘

خود اپنی مستند و معتبر کتاب کی روایات کے باوجود جو لوگ عبداللہ بن سبا کی شخصیت کو قریباً تیرہ چودہ صدیوں کے بعد افسانوی اور فرضی شخصیت قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں‘ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعلق کیا کہا جائے! رجال کشی کی روایات کو جھٹلا کر وہ اپنے مذہب کی بنیاد کو منہدم کر رہے ہیں۔

عبداللہ بن سبا اور اس کے پیروکاروں نے جس فتنے کی بنیاد رکھی‘ حضرت علیؓ اور ان کے اہلِ بیت کی پُر زور تردید کے بعد بھی اس فتنہ کا دروازہ بند نہیں ہوا اور اس کے مضر نتائج اور گمراہ کن عقائد تا حال موجود ہیں‘ جن کا خمیازہ اُمت صدیوں سے بھگتتی چلی آ رہی ہے۔

دوسری انتہا: خوارج

جنگِ صفینؔ میں تحکیم قبول کر لینے کا ایک شدید ردّعمل یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کے لشکر کی ایک معتد بہ اور قابل لحاظ تعداد اس مسئلہ پر آپؓ کی مخالفت کے اعتبار سے دوسری انتہا تک پہنچی اور ’’خوارج‘‘ کہلائی۔ جب حکم بنانے کا مطالبہ ہوا تو دونوں لشکروں میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اس کے ناکام ہو جانے اور صفینؔ سے کوفہ واپس آنے کے بعد ان خوارج نے حضرت علیؓ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ‘ نقل کفر کفر نہ باشد‘ انہیں کافر قرار دیا۔ اور کافر ہو گئے تو مرتد ہو گئے۔ اب توبہ کریں‘ تجدید ایمان کریں‘ ورنہ ارتداد کے باعث واجب القتل ہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ آپ نے تحکیم کیوں قبول کی‘ جبکہ الفاظِ قرآنی ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ کے مطابق اللہ کے سوا کوئی حکم نہیں‘ کوئی حاکم نہیں‘ کوئی حکم دینے کا مجاز نہیں۔ آپ نے کیسے کسی کو حَکم مان لیا؟ گویا آپ کو اس بات پر یقین نہیں ہے کہ آپ خلیفہ برحق ہیں‘ آپ نے اس صریح واضح اور بیّن بات کو متنازع تسلیم کر لیا اور یہ مان لیا کہ آپ کی خلافت نزاعی ہے۔ خوارج ان اعتراضات کی بنیاد پر حضرت علیؓ پر ارتداد کا بہتان لگا کر آپ سے توبہ اور تجدید ایمان کا مطالبہ کرتے تھے۔

حضرت علیؓ بڑے حلیم الطبع‘ صلح جُو اور نرم مزاج کے مالک تھے۔ آپؓ کو خون ریزی قطعی پسند نہیں تھی۔ چنانچہ آپؓ نے آخری حد تک کوشش کی کہ خوارج اپنی ضلالت اور گمراہی سے توبہ کر لیں اور باز آ جائیں۔ حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ گفت و شنید اور افہام و تفہیم کی انتہائی کوشش کی۔ بہت سے سربرآوردہ لوگوں کو بار بار ان کے پاس بھیجا۔ ان کے قائدین کو بلا کر‘ خود بھی انہیں خوب سمجھایا‘ اور جب وہ اپنے اس موقف سے ہٹنے کے لیے بالکل تیار نہ ہوئے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر تم اس عقیدے پر قائم رہو اور یہ باطل نظریہ اپنے تک محدود رکھو تب بھی میں تمہارے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا‘ تم سے کوئی تعرض نہ کروں گا‘ بشرطیکہ تم بدامنی اور غارت گری کا ارتکاب نہ کرو۔ البتہ اگر فتنہ و فساد پھیلاؤ گے تو پھر مجھے تمہارے خلاف اقدام کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے اور اپنے نظریات میں اتنے پختہ تھے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں یہ چھاپے اور شب خون مارتے اور فرار ہو جاتے‘ دوبدو باقاعدہ جنگ سے گریز کرتے‘ لیکن بالآخر نہروان کے مقام پر دونوں لشکر باقاعدہ مقابلے کے لیے آمنے سامنے آ گئے۔ اُس وقت بھی حضرت علیؓ

For more books visit :www.tanzeem.org

نے بڑی کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے' ان کے ساتھ مصالحت ہو جائے اور انہیں سمجھا دیا جائے۔ آپؓ نے آخری تدبیر یہ اختیار کی کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو سفید جھنڈا دے کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور اعلان کرا دیا کہ جو بھی اس جھنڈے تلے آ جائے گا اس کے لیے امان ہے۔ وہ گویا غیر جانبدار ہو گیا' اِدھر رہا نہ اُدھر رہا۔ آپؓ کی اس تدبیر سے کافی لوگ خوارج کے لشکر سے نکل کر اُدھر چلے گئے۔ اس کے بعد بھی خوارج کے لشکر میں قریباً ساڑھے چار ہزار افراد باقی رہ گئے۔ پھر جب دو بدو جنگ ہوئی تو ان میں سے نو افراد کے سوا سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ اس بہادری سے لڑے کہ ان کی شجاعت کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں ثبت ہو گئے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ بعض اوقات مغالطہ بھی کس قدر شدید ہوتا ہے۔ تھا تو یہ ان کا مغالطہ ہی' لیکن اتنا شدید کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم حق پر ہیں اور حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی ناحق پر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس باطل نظریے اور عقیدے کی خاطر اپنی جانیں دے دیں جو ان کے قلوب واذہان میں بیٹھ گیا تھا۔ تو یہ بات جان لیجیے کہ نظریے اور عقیدے کی محبت' خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو' انسان کو جان کی بازی لگانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ بہرحال دورِ علوی میں خوارج نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان کے علیحدہ عقائد تھے جن کے بارے میں وہ بڑے متشدّد تھے۔ بنو عباس کی خلافت کے آغاز تک ان کی شورشیں اور بغاوتیں جاری رہیں۔ غالباً عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے ان کا پوری طرح قلع قمع کیا۔

خوارج کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی شہادت

جنگِ صفین کے فوراً بعد ہی تین خارجیوں نے خفیہ طور پر طے کیا کہ جب تک تین اشخاص حضرت علی' امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہم) صفحۂ ہستی پر موجود ہیں دنیائے اسلام کو خانہ جنگی سے نجات نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ تینوں بیک وقت ان تین حضرات کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے اور اس کے لیے تاریخ اور وقت طے ہو گیا۔ ابن ملجم کے ہاتھوں کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس شقی اور بدبخت سے ایک خوبصورت خارجی عورت نے مہم کی کامیابی کے بعد شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اسی روز دمشق میں نمازِ فجر ہی کے دوران امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا لیکن وار اوچھا پڑا اور وہ بچ گئے۔ حملہ آور گرفتار ہو گیا جسے قتل کر دیا گیا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس صبح کو خود امامت کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے دھوکہ میں وہ صاحب شہید ہوئے جو ان کی جگہ امامت کرا رہے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ملجم نے زہر آلود خنجر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اُس وقت وار کیا جب آپ رضی اللہ عنہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے' سربسجدہ میں تھا اور دل راز و نیازِ الٰہی میں مصروف تھا۔ سر پر کاری زخم آیا۔ زندگی کی امید نہ رہی۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو نہایت مفید نصائح کیں۔ اُسی روز یعنی ۲۰ رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ کی شب کو فضل و کمال' رشد و ہدایت اور تقویٰ وطہارت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا...... اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔ ابن ملجم گرفتار ہو گیا تھا۔ آپؓ نے وصیت کی کہ اگر میں بچ گیا تو خود ہی اس سے نمٹ لوں گا' اگر میری موت واقع ہو جائے تو قصاص میں اسے قتل کر دیا جائے اور اس کی نعش کی کوئی بے حرمتی نہ کی جائے۔

ایک تقابل

اب آپ دیکھیے کہ ایک انتہا یہ ہے کہ خوارج نے خلیفۂ راشد' امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرتد قرار دے کر واجب القتل ٹھہرایا اور ان کے ایک شقی نے آخر کار اس بطلِ جلیل کو شہید کر ڈالا۔ گویا اپنی دانست میں آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کی سزا دے دی۔ اور دوسری انتہا پر عبداللہ بن سبا اور اس کی معنوی ذُریت پہنچی' جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا قرار دیا اور اس کفر' شرک اور باطل عقیدے کی خاطر اپنی جانیں دے دیں۔ اب آپ سوچیے کہ کسی اور صحابیؓ کے بارے میں ان دو انتہاؤں کا عشرِ عشیر بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔

موجودہ دَور میں غُلوّ کے مَظاہر

میں نے یہ جو انتہائیں بیان کی ہیں' ان کے بانی مبانی تو وہ ہیں جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں۔ اب ذرا دائرہ اسلام کے اندر ان انتہاؤں کے مختلف شاخسانوں اور باطل اثرات کا جائزہ لیجیے۔

محبت میں غلوّ

اس ضمن میں اہلِ تشیع کے ذکر کو سردست ایک طرف رکھیے' امامتِ معصومہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سُنیوں کا جو حال ہے' اس پر غور کیجیے۔ کیا ہمارے عوام الناس بلکہ خواص کے بھی قابلِ اعتناء حصہ کی زبانوں پر ''علی مشکل کشا'' اور ''یا علی مددٗ'' کے الفاظ چڑھے ہوئے نہیں ہیں؟ ایک اعتبار سے یہ سب سبائیت کے عقیدے کے ظہور اور اسی کے اثرات ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ کوئی ''یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدد'' نہیں کہتا' ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشکل کشا'' کے الفاظ کسی سنی کی زبان پر نہیں آتے۔ تو کیا حضرت علیؓ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اونچے ہیں؟ ایک گروہ اپنے امتیاز کے اظہار کے لیے ضرور اپنی مساجد پر ''یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھوالے گا اور اس کے طغرے گھروں میں لگالے گا' مگر آج تک کبھی ''یا محمدؐ مدد'' اور ''محمدؐ مشکل کشا'' کے الفاظ سننے میں نہیں آئے[1]۔ یہ ظلم جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ نہیں ہوا۔ یہ اللہ کی خصوصی حفاظت کا مظہر ہے کہ اس طرح کا شرک اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ منسوب نہیں ہوا۔

بُغض وعداوت میں غُلوّ

اسی طرح اگر آپ دوسری انتہا کو دیکھنا چاہیں گے' یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت اور دشمنی کو' جس کا خوارج نے ارتکاب کیا تھا' تو ہم سُنیوں میں بھی ایک طبقہ موجود ہے' اور یہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ہے جو ایک ردِّعمل کا شکار ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خلافت کے امیدوار تھے یا کسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ان کا ہاتھ بھی تھا۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! بدقسمتی سے ایسے لوگ ہماری صفوں میں موجود ہیں اور یہ ناصبی کہلاتے ہیں۔ یہ طبقہ خلافت بنی اُمیہ سے چلا آ رہا ہے اور ایک خاص ردِّعمل سے متاثر ہو کر وہی کام کر رہا ہے جو خوارج اور عبداللہ بن سبا نے کیا تھا۔ نتیجہ تو ایک ہی نکلتا ہے۔ صحابہؓ اور وہ بھی کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو متہم کر دیا جائے' انؓ کی سیرت کو کسی طرح داغدار کر دیا جائے تو اصل داغ کہاں لگے گا؟ جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اَقدس پر! صحابہ کرامؓ تو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا شاہکار ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت' تعلیم' تلقین' تربیت اور تزکیہ کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ آپ کو معلوم ہے کہ

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تو جنابِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ انہی صحابہؓ ہی سے تو پہچانے جائیں گے۔ آپ کسی سکول کی ایک عام کلاس میں جاتے ہیں اور اگر کلاس کا نتیجہ اچھا ہے تو آپ اس کا کریڈٹ کس کو دیں گے؟ کامیابی کا سہرا کس کے سر پر باندھیں گے؟ استاد کے سر پر! ـــــ لیکن اگر کلاس کا رزلٹ بحیثیت مجموعی خراب آ رہا ہے تو آپ کس کو مورِدِ الزام ٹھہرائیں گے؟ استاد کو ـــــ تو معاملہ درحقیقت یہ ہے کہ ع ''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!'' ـــــ کوئی چاہے حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی سیرت کو داغدار کرے چاہے علیؓ کی سیرت کو، بات تو ایک ہی ہے۔ چاروں اسی درخت کے پھل ہیں۔ چاہے اِدھر سے تیر چلاؤ، چاہے اُدھر سے چلاؤ، وہ تیر پہنچے گا حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر۔ ہاں یہ مکروفریب اور ہوشیاری وچالاکی ہے کہ اگر براہِ راست حضور ﷺ کی ذات کو ہدف بنائیں گے تو یقیناً خون کی ندیاں بہہ جائیں گی، چنانچہ عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں نے اس لیے یہ ترکیب سوچی کہ ذرا نیچے اتر کر صحابہؓ کی سیرتوں کو مشکوک بنا دو، تو اس کی زد از خود حضور ﷺ کی ذات پر پڑے گی۔ لہٰذا جو شخص بھی یہ کام کرتا ہے، وہ چاہے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سیرت پر حملہ کرے، چاہے وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی سیرت کو داغدار کرے، چاہے حضرات حسنینؓ اور حضرت معاویہؓ کی سیرت کو داغدار کرے، بات تو حضور ﷺ کی ذات تک پہنچے گی۔ لہٰذا خود کو ''سُنّی'' کہنے والا جو شخص بھی ان حضرات کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی ذات پر بھی حملہ کرے گا، ان کی نیتوں پر کسی شک کا اظہار کرے گا یا ان کے بارے میں کوئی الزام تراشی کرے گا، میرے نزدیک اسے ''سُنّی'' کہلانے کا حق قطعاً نہیں ہے، کیونکہ جو بھی یہ کام کرتا ہے وہ گویا آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دشمنوں کا آلۂ کار بن رہا ہے۔

مسئلہ کے اس پہلو کی اہمیت کی وضاحت کے لیے میں نبی اکرم ﷺ کی ایک مشہور حدیث سنا کر آگے بڑھوں گا۔ یہ وہ حدیث ہے جو عموماً خطباتِ جمعہ میں بھی پڑھی جاتی ہے۔ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مغفلؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

> اَللّٰهَ اللّٰهَ فِي اَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِي، فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي اَحَبَّهُمْ، وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي اَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ، وَمَن آذَى اللّٰهَ يُوْشِكُ اَنْ يَأْخُذَهُ [1]
>
> ''میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد (تنقید کا) نشانہ نہ بناؤ۔ پس جس شخص نے ان کو محبوب جانا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب جانا، اور جس شخص نے ان کے ساتھ بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا۔ اور جس نے ان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی، اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی، اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو عنقریب وہ اسے گرفت میں لے لے گا۔''

حضرت علیؓ کا مزاج اور مقام

اب آئیے، اس طویل بحث کی طرف جو میں نے ''مزاج'' کے بارے میں ابتدا میں کی ہے۔ آپ بھی جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے جو ''مزاج'' بیان کیے ہیں، ان میں حضرت علیؓ کو میں کس مقام پر سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؓ کی شخصیت ''Ambivert'' ہے۔ ایک جامع الصفات شخصیت جس کے اندر دونوں رنگ موجود ہیں، صدّیقیت کا بھی اور شہادت کا بھی۔ حضور ﷺ کی شخصیت کا ایک عکس جامعیت کے ساتھ آپ کو حضرت علیؓ کی شخصیت میں نظر آئے گا۔

شیرِ خداؓ کی شجاعت

حضرت علیؓ کی شخصیت میں کمال درجہ کی شجاعت اور بہادری تھی جو صرف چھپی ہوئی نہیں تھی بلکہ ظاہر و باہر تھی۔ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ بھی یقیناً بہت شجاع تھے۔ اس خطبہ کے الفاظ یاد کیجیے جو حضرت علیؓ نے صدیق اکبرؓ کے انتقال پر دیا تھا کہ ''اے ابابکرؓ! ہم میں سب سے زیادہ شجاع اور بہادر آپ تھے۔ وہ تم تھے جو بدر کی شب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی آرام گاہ پر پہرہ دے رہے تھے اور اللہ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کی غارِ ثور اور اثنائے سفرِ ہجرت کی رفاقت کے لیے آپ کو منتخب فرمایا تھا''۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی شجاعت کا ظہور اس طرح سے نہیں ہوا جس طرح حضرت علیؓ کی شجاعت کا ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کا کسی پہلوان سے مقابلے کا کوئی ذکر سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ارادہ اور عزم کی بات اور ہے کہ جب آپؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن نے، جو غزوۂ بدر تک ایمان نہیں لائے تھے، ایمان لانے کے بعد آپؓ سے کہا کہ ''ابا جان، بدر میں آپؓ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپؓ کا لحاظ کیا اور اپنا ہاتھ روک لیا'' تو جواب میں آپؓ نے فرمایا: ''بیٹے، تم نے یہ اس لیے کیا کہ تم باطل کے لیے لڑ رہے تھے۔ خدا کی قسم اگر تم میری زد میں آ جاتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا''۔ اسی عزیمت، اسی قوتِ ارادی، اس استقامت اور اسی شجاعت کا اظہار اُس وقت ہوا جب مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد آپؓ سے حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے اکابر صحابہؓ نے یہ کہا تھا کہ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف فی الوقت محاذ نہ کھولیے ـــــ اس لیے کہ مسلمانوں کی بیشتر افواج فتنۂ ارتداد کی سرکوبی میں مصروف تھیں جو بڑے پیمانے پر عرب کے بعض علاقوں میں پھیل گیا تھا ـــــ تو اس پیکرِ عزیمت نے کہا تھا کہ ''خدا کی قسم اگر مجھے یہ یقین ہو کہ کتے میری لاش کو نوچ کھسوٹ ڈالیں گے تب بھی میں ان مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف اقدام سے باز نہیں آؤں گا۔ اور اگر وہ حضور ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ میں اونٹ کے ساتھ رسی بھی دیتے تھے اور اب رسی نہ دیں تو بھی میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ کسی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں اکیلا جہاد کروں گا''۔ لیکن اسے چھپی ہوئی (potential) شجاعت کہا جائے گا۔ یہ اس طرح ظاہر نہیں ہوئی جیسے میدانِ جنگ میں حضرت حمزہؓ کی شجاعت اور حضرت عمرؓ کی بہادری کا ظہور ہوا۔ حضرت عمرؓ کی وہ بات یاد کیجیے جو آپؓ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت کہی۔ آپؓ نے پہلے کعبہ کا طواف کیا اور پھر اعلان کیا کہ میں مدینہ ہجرت کر رہا ہوں، جس کی خواہش ہو کہ اس کی ماں اس کو روئے وہ آئے اور میرا راستہ روک لے۔ سب کے سب مشرک دم بخود رہ گئے۔ یہ بات حضرت ابوبکرؓ میں آپ کو نظر نہیں

آئے گی۔

میں یہاں ایک بات اور بھی عرض کر دوں' لیکن خدارا میری بات کو غلط مفہوم میں نہ لیجیے گا۔ نبی اکرم ﷺ میں شجاعت اور بہادری بتمام وکمال موجود تھی' لیکن اس کا بھی اس طور سے ظہور نہیں ہوا۔ بلا ریب وشبہ ساری نوعِ انسانی میں سب سے زیادہ شجاع اور بہادر جناب محمد ﷺ ہیں۔ شجاعت جیسا اعلیٰ وصف یقیناً سب سے بڑھ کر حضور ﷺ میں تھا اور اس کا ظہور غزوۂ حنین کے موقع پر ہوا بھی ہے۔ جب ایک عام بھگدڑ مچ گئی' لوگ منتشر ہو گئے تو حضور ﷺ اُس وقت اپنی سواری سے اترے' علم اپنے دستِ مبارک میں لیا اور یہ رجز پڑھا ؎

اَنَـــا الـــنَّبِـــیُّ لَا کَـــذِب اَنَـــا ابْـــنُ عَبْـــدِ الْـــمُـــطَّـــلِـــب (۱)

میرا گمان ہے کہ یہ رجز حضور ﷺ نے فی البدیہہ پڑھا ہے اور گویا یہ واحد شعر ہے جو حضور ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں کہا ہے۔ بہرحال اُس وقت آپؐ کی شجاعت سامنے آئی ہے۔ تو ایک شجاعت چھپی ہوئی ہوتی ہے جبکہ ایک ہوتی ہے ظاہر و باہر شجاعت۔ حضرت علی ؓ کی شجاعت صرف چھپی ہوئی نہیں بلکہ ظاہر و باہر اور نمایاں شجاعت ہے۔ وہ شجاعت جو بدر میں ظاہر ہو رہی ہے جب کہ شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ بن ربیعہ دونوں حضرت علیؓ کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے۔ پھر آپؓ کی تلوار نے بجلی کی طرح چمک چمک کر اعدائے اسلام کے خرمنِ ہستی کو جلا دیا۔ غزوۂ اُحد میں حضرت مصعب بن عمیر ؓ کے شہید ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے بڑھ کر انؓ کے ہاتھ سے علم سنبھالا اور چند صحابیوں کے ساتھ مل کر بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے مشرکین کا رخ پھیر دیا' جو حضور ﷺ کی طرف یلغار کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اسی شجاعت کا ظہور ۵ ھ میں غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا۔ چند کفار کبھی کبھی گھوڑوں پر سوار ہو کر خندق میں گھس کر حملہ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حملہ آوروں میں عمرو بن عبدِوُد بھی شامل تھا جو پورے عرب میں مانا ہوا بہت بڑا پہلوان تھا۔ اُس وقت اس کی عمر نوے برس کی تھی لیکن پورے عرب میں کوئی اس کے ساتھ مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مبارزت طلب کی اور نعرہ لگایا کہ ہے کوئی جو میرا دوبدو مقابلہ کرے؟ اُس وقت حضرت علی ؓ مقابلہ کے لیے آگے بڑھے۔ وہ ہنسا اور بولا: تم میرا مقابلہ کرنے آئے ہو؟ نام کیا ہے تمہارا؟ اس نے بڑے استہزائیہ انداز میں کہا کہ میری عادت رہی ہے کہ جب میرا کسی سے مقابلہ ہوتا ہے تو اس کی تین خواہشوں میں سے ایک ضرور پوری کرتا ہوں۔ بولو تمہاری کیا خواہش ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری اوّلین خواہش تو یہ ہے کہ تم ایمان لے آوَ۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی سوال نہیں۔ حضرت علی ؓ بولے کہ میری دوسری خواہش یہ ہے کہ تم میدانِ جنگ سے واپس چلے جاوَ۔ وہ ہنسا' اور بولا یہ بزدلی کا کام میں کروں! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تو پھر تیسری خواہش یہ ہے کہ آوَ مقابلہ کرو تاکہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ یہ حضرت علی ؓ کی ذہانت و فطانت کا بھی مظہر ہے کہ آنجنابؓ نے پہلے اس کو حکمت کے ساتھ دعوتِ حق دی' پھر دعوتِ مقابلہ۔ لیکن اس بدبخت کے نصیب میں ایمان کی سعادت نہیں تھی۔ حضرت علی ؓ کی بات پر وہ بھونچکارہ گیا کہ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ میرے منہ پر کوئی مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے۔ پھر وہ برہم ہو کر گھوڑے سے کود پڑا۔ تھوڑی دیر تک شجاعانہ مقابلہ کے بعد حضرت علیؓ کی تلوار نے اس کو واصلِ جہنم کر دیا۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت علی ؓ حضور ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے سات قلعے تھے۔ چھ تو فتح ہو گئے' لیکن آخری قلعہ قموص زیادہ سخت ثابت ہوا۔ پہلے حضرت ابوبکر ؓ اور ان کے بعد حضرت عمر ؓ اس کی تسخیر کے لیے مامور ہوئے' لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کل ایک ایسے بہادر کو علم دوں گا جو خدا اور رسول کا محبوب ہے اور اس قلعہ کی فتح اس کے لیے مقدر ہے۔ صبح ہوئی تو ہر جاں نثار متمنی تھا کہ کاش اس فخر وشرف کا تاج اس کے سر کی زینت بنے۔ حضور ﷺ نے دفعتاً حضرت علیؓ کو پکارا۔ وہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔ حضور ﷺ نے ان کی آنکھوں پر لعابِ دہن لگایا جس سے ان کی تکلیف جاتی رہی۔ پھر علم مرحمت فرمایا۔ اس قلعہ کا سردار مرحب نامی یہودی تھا جو فنونِ حرب میں یکتا و یگانہ شمار ہوتا تھا' جثہ کے لحاظ سے بھی بڑا لحیم اور شحیم تھا۔ علم لینے کے بعد حضرت علیؓ نے پوچھا: حضور کیا میں قلعہ والوں کو قتل کر دوں؟ حضور ﷺ نے اس موقع پر یہ تاریخی جملے فرمائے: ''نہیں علی ؓ پہلے ان پر اسلام پیش کرو' ان کو دعوت دو' کیونکہ تمہاری کوششوں سے اگر ایک شخص بھی مسلمان ہو گیا تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ اس حدیث شریف کے آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں: ((فَوَاللّٰہِ لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلاً وَاحِدًا خَیْرٌ لَکَ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ''(۱) (یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اس کے راوی حضرت سہل بن سعدؓ ہیں۔)

حضرت علی ؓ نے جب قلعہ قموص کا محاصرہ کیا تو مرحب آہن پوش ہو کر ہتھیار سجا کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ یہ متکبرانہ رجز پڑھتا ہوا مبارزت کے لیے نکلا: ؎

قَـــدْ عَـــلِـــمَـــتْ خَیْبَـــرُ اَنّـــیْ مَـــرْحَـــبُ
شَـــاکِـــیْ السِّـــلَاحِ بَـــطَـــلٌ مُـــجَـــرَّبُ
اِذَا الْـــحُـــرُوْبُ اَقْبَـــلَـــتْ تَـــلَھَّـــبُ

''خیبر مجھے جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں' مسلح پوش' بہادر اور تجربہ کار ہوں۔ جب جنگ میرے سامنے آتی ہے تو بھڑک اٹھتی ہے۔''

فاتحِ خیبر علی مرتضیٰ ؓ نے جواب میں یہ رجز پڑھا: ؎

اَنَـــا الَّـــذِیْ سَـــمَّـــتْـــنِـــیْ اُمِّـــیْ حَـــیْـــدَرَہ
کَـــلَـــیْـــثِ غَـــابَـــاتٍ کَـــرِیْـــہِ الْـــمَـــنْـــظَـــرَہ
اُوْفِیْھِـــمُ بِـــالـــصَّـــاعِ کَـــیْـــلَ الـــسَّـــنْـــدَرَہ

''میں وہ ہوں جس کا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے۔ جنگل کے شیر کی طرح مہیب اور ڈراونا۔ میں دشمنوں کو نہایت سرعت سے قتل کرتا ہوں۔''

اور جھپٹ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد آپؓ نے قلعہ پر حملہ کیا اور حیرت انگیز شجاعت کا مظاہرہ کرتے

For more books visit :www.tanzeem.org

ہوئے اس کو فتح کر لیا۔

غزوۂ حنین میں بھگدڑ کے وقت ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

شعر وادب اور فصاحت و بلاغت

اب جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک رجز کا ذکر آ گیا تو عرض کرتا چلوں کہ جہاں آپؓ میں ظاہر و باہر شجاعت کا جوہر موجود ہے اور قوائے عملیہ انتہائی چاق و چوبند ہیں' جن کے ظہور کے چند واقعات میں نے آپ کو سنائے' وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ شعر و ادب میں بھی بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ آپؓ فصاحت و بلاغت کی معراج پر ہیں۔ عام طور پر جو لوگ شجاع اور مردِ میدان ہوتے ہیں' ان میں شعر وادب اور فصاحت و بلاغت کا ذوق بہت کم ہوتا ہے' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بحر کے بھی شناور ہیں۔ افصح العرب تو یقیناً جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا قول ہے ''اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ'' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خطابت' فصاحت و بلاغت اور شاعری میں میرے مطالعہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت علیؓ کے آس پاس آنے والا بھی کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت علیؓ ان گنتی کے چند صحابہؓ میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ پھر آپؓ عربی گرامر کے موجد ہیں' علمِ نحو کے ابتدائی اصول آپؓ ہی کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت علیؓ کے اشعار پڑھیے' آج بھی انسان وجد میں آتا ہے۔ کتنے حکیمانہ اشعار ہیں اور ان میں کتنی بے ساختگی ہے ؎

یغوصُ البحرَ مَن طلب اللآلی
ومَن طلَب العُلٰی سہِر اللّیالی
ومن طلَب العلٰی مِن غیر کدٍّ
اضاع العمرَ فِی طلب المُحال

ترجمہ: ''جو کوئی بھی موتی چاہتا ہے تو اسے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ اور جو شخص زندگی میں کوئی اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے۔ جو کوئی بلندی بھی چاہے اور محنت نہ کرے وہ شخص اپنی عمر کو ایک محال شے کی طلب میں ضائع کر بیٹھتا ہے۔''

تقریر وخطابت

شاعری کے علاوہ تقریر وخطابت میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل اور موضوعات پر بھی فی البدیہہ تقاریر فرماتے تھے جو نہایت خطیبانہ' مدلل اور مؤثر ہوتی تھیں۔ آپؓ کے خطبات' اشعار اور حکیمانہ اقوال آج بھی ''نہج البلاغۃ'' کے نام سے چار جلدوں میں موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں بہت سا رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں کتنے صحیح ہیں اور کتنے موضوع بلکہ باطل نظریات سے مملو ہیں' اس سوال کو فی الحال نظر انداز کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کو فراستِ مؤمنانہ سے نوازا ہے' وہ سونے اور پیتل کی اس آمیزش میں سے زرِ خالص نکال لاتے ہیں۔ البتہ کسی نے یہ بات صحیح کہی ہے کہ ان خطبات نے ہزاروں لاکھوں اہلِ تشیع کو ذاکر' واعظ اور خطیب بنا دیا ہے۔

زہد وقناعتُ

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات پر وہ زُہد ختم ہو گیا جس کا پیکرِ کامل جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بچپن سے پچیس چھبیس برس کی عمر تک حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو اور عکس آپؓ کی شخصیت میں پیدا ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا آپؓ کی زندگی میں دُنیوی عیش و آرام کا کیا سوال! حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہوا' الگ مکان میں رہے۔ اس گھریلو زندگی کی آسائشوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کی زرہ فروخت کر کے گھر گرہستی کے لیے جو سامان خرید کر دیا تھا' عمر بھر اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے گٹے پڑ گئے تھے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مل کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کنیز یا غلام دینے کی درخواست کی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اس سے بہتر چیز نہ بتا دوں؟ پھر آپؐ فرمایا کہ تم دونوں جب رات کو سونے لگو تو ۳۳ بار تسبیح' ۳۳ بار تحمید اور ۳۴ بار تکبیر کہہ لیا کرو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُس وقت سے میں نے اس تسبیح کو کبھی ترک نہیں کیا۔ کسی نے پوچھا کیا صفین کی شب میں بھی نہیں؟ فرمایا کہ ''ہاں صفین میں بھی نہیں!''۔

فقر و درویشی کا یہ عالم تھا کہ ہفتوں گھر میں دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ بھوک کی شدت ستاتی تو پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔ عہدِ فاروقی میں جب آپؓ کا وظیفہ مقرر ہوا تو آپ اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیتے تھے۔ ایامِ خلافت میں بھی زہد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ موٹا جھوٹا لباس اور روکھا پھیکا کھانا آپؓ کے لیے دنیا کی بڑی نعمت تھی۔ مسند احمدؒ ہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک مہمان شریکِ طعام تھے' انہوں نے معمولی اور سادہ کھانا دیکھ کر کہا: امیر المومنین! بیت المال میں اللہ کے فضل سے مال و اسباب کی کافی بہتات ہے۔ آپؓ نے جواب میں فرمایا: ''خلیفۂ وقت کو مسلمانوں کے مال میں صرف اتنا حق ہے کہ سادگی کے ساتھ خود کھائے اور اپنے اہل و عیال کو کھلائے' بقیہ سارا مال خلقِ خدا کے لیے ہے''۔ دورِ خلافت میں جب تک مدینہ میں قیام رہا آپؓ کی رہائش اپنے سابقہ مٹی اور گارے سے بنے ہوئے حجرے میں رہی۔ جب دار الخلافہ کوفہ منتقل کیا تو دار الامارت میں قیام کی بجائے ایک میدان میں سادہ خیمہ لگوا کر اس میں قیام کیا' اور فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ محلاّت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا' مجھے بھی اس کی حاجت نہیں' میرے لیے میدان میں خیمہ کافی ہے''۔ پھر خیمہ پر نہ کوئی دربان تھا نہ کوئی حاجب۔ خلیفۂ وقت ایک معمولی غریب کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ فیاضی اور داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ دورِ خلافت میں آپؓ عموماً بیت المال کا سارا مال تقسیم کر کے جھاڑ و پھیر دیا کرتے اور پھر دو رکعت نماز شکرانے کے طور پر ادا فرماتے۔ ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عمر بن عبد البرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک دفعہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''میری تلوار کون خریدتا ہے؟ واللہ اگر میرے پاس تہبند کی قیمت ہوتی (جس کی مجھے اشد ضرورت ہے) تو اس کو فروخت نہ کرتا''۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا ''امیر المومنین میں آپؓ کو تہبند کی قیمت بطور قرض دیتا ہوں۔''

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ سورۃ الدھر کی یہ آیت ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨﴾ حضرت علیؓ کے زہد اور انفاق وایثار کی ستائش کے طور پر نازل ہوئی۔ ایک دفعہ آپؓ نے رات بھر ایک باغ کو سینچ کر مزدوری میں تھوڑے سے جَو حاصل کیے اور صبح ان کا ایک تہائی حصہ پسوا کر حریرہ پکوانے کا انتظام کیا۔ ابھی تیار ہی ہوا تھا کہ ایک مسکین نے صدا لگائی‘ آپؓ نے سب حریرہ اٹھا کر اسے دے دیا۔ پھر بقیہ میں سے دوسرے ثلث کے پکوانے کا انتظام کیا‘ لیکن جیسے ہی وہ تیار ہوا ایک مسکین یتیم نے دستِ سوال بڑھایا‘ آپؓ نے یہ اس کی نذر کر دیا۔ اب جو تیسرا حصہ بچا تھا وہ پکنے کے بعد ایک مشرک قیدی کے سوال پر اس کو دے دیا گیا اور اس اللہ کے بندے نے رات بھر کی مشقت سے کمائی ہوئی پونجی اللہ کی راہ میں دے کر خود بھی فاقہ کیا اور اسؓ کے اہل وعیال بھی دن بھر فاقہ سے رہے۔ آپؓ کے پاس دنیوی دولت نہ تھی لیکن دل اتنا غنی تھا کہ شاید ہی کوئی سائل کبھی آپؓ کے در سے خالی ہاتھ گیا ہو۔

سادگی اور تواضع

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سادگی اور تواضع آپؓ کی دستارِ فضیلت کا خوش نما طرّہ تھا۔ آپؓ اپنے ہاتھ سے محنت ومزدوری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لوگ مسائل پوچھنے آتے تو آپ کو کبھی جوتے ٹانکتے‘ کبھی اونٹ چراتے اور کبھی زمین کھودتے پاتے۔ مزاج میں سادگی کا یہ عالم تھا کہ فرشِ خاک پر بے تکلف سو جاتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ آپؓ کو ڈھونڈتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ آپؓ زمین پر بے تکلفی سے سو رہے ہیں‘ چادر جسم سے سرک گئی ہے اور جسم غبار آلود ہو گیا ہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے آپؓ کا بدن صاف کیا اور نہایت محبت بھرے لہجے میں فرمایا ’’اِجْلِسْ یَا اَبَا تُرَاب‘‘ (اے مٹی والے! اب اٹھ بیٹھو!)۔ حضور ﷺ کی عطا کردہ یہ کنیت آپؓ کو اتنی عزیز تھی کہ جب کوئی آپؓ کو ’یا ابا تراب‘ کہہ کر مخاطب کرتا تو خوشی کے مارے چہرہ دمک اٹھتا اور ہونٹوں پر تبسم کی لہر آ جاتی۔ عہدِ خلافت میں بھی یہ سادگی قائم رہی۔ معمولی لباس میں بازار کا گشت کرتے۔ اگر کوئی شخص پیچھے پیچھے چلتا یا آپؓ کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا تو منع فرماتے کہ اس میں والی کے لیے فتنہ اور مؤمن کے لیے ذلت ہے۔

احساسِ بندگی اور تقویٰ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ عبادت وریاضت اور آزمائش وامتحان میں ہمارے شیخ الشیوخ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ چونکہ حضرت علیؓ کو حضور ﷺ کی صحبت میں رہنے کا طویل ترین موقع ملا تھا اس لیے تقویٰ اور نفلی عبادات میں بھی آپؓ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ آپؓ کی نماز میں خشوع وخضوع کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ دورانِ نماز بید کی طرح لرزتے تھے۔ سیرت کی مستند کتابوں میں یہ عجیب واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ میں آپؓ کے جسم میں تیر پیوست ہو گیا۔ لوگوں نے تیر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں نکل سکا۔ آپؓ نے فرمایا کہ میں نفل نماز شروع کرتا ہوں‘ اس حالت میں نکالنے کی کوشش کرنا۔ روایات میں آتا ہے کہ نماز میں آپ کا جسم اتنا نرم پڑ گیا کہ تیر آسانی سے نکل آیا اور آپؓ کو تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔

علم وفضل اور حکمت

آپؓ کے متعلق جامع ترمذی میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ ’’اَنَا مدینۃُ العلمِ و علیٌّ بابُھا‘‘ (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اُس کا دروازہ ہے۔) اگرچہ امام ترمذیؒ اور چند دیگر محدثین نے اس کی اسناد کو ضعیف بتایا ہے لیکن موضوع کسی نے قرار نہیں دیا۔ اسلام کے علوم ومعارف کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ آپؓ نے اس سرچشمہ سے پوری طرح سیرابی حاصل کی۔ آپؓ نہ صرف حافظ وقاریٔ قرآن تھے بلکہ علومِ قرآنی سے بھی آپؓ کو خصوصی شغف تھا۔ بالخصوص آیات کے شانِ نزول کے علم میں آپ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ آپؓ کا شمار مفسّرین کے اعلیٰ طبقہ میں ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اس کمال میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سوا اور کوئی شریک نہیں۔ قرآن مجید سے مسائل کے استنباط میں آپؓ کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ خوارج نے جب تحکیم کے مسئلہ میں فتنہ اٹھایا‘ تو آپؓ نے بہت سے حفاظِ قرآن اور علماء کو جمع کر کے خوارج کے چند سربرآوردہ افراد کی موجودگی میں ان سے دریافت فرمایا کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو تو اللہ نے حَکَم بنانے کی اجازت دی ہے کہ نہیں؟ لہٰذا جب اُمت کے دو گروہوں میں اختلاف ہو جائے تو حکم بنانا جائز ہوگا یا نہیں؟ حفاظ وعلماء نے آپؓ کی تائید کی‘ لیکن خوارج اپنے موقف پر اڑے رہے۔ خوارج ’’اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ‘‘ سے تحکیم کے خلاف جو استدلال کرتے تھے‘ اس کے متعلق آپ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ ’’کلمۃُ حقٍّ اُرِیدَ بِھا الباطِلُ‘‘ یعنی اگرچہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اس سے خوارج کا یہ استدلال واستنباط صریحاً غلط ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ مشہور ہے کہ آپؓ نے قرآن مجید کو نزولی ترتیب سے بھی مرتب کیا تھا۔ واللہ اعلم! بعض دوسرے صحابہؓ کی طرح آپؓ کا نام بھی کاتبانِ وحی میں شامل ہے۔ مزید یہ کہ حضور ﷺ کے جو مکاتب وفرامین لکھے جاتے تھے‘ ان میں سے بعض کو تحریر کرنے کا شرف آپؓ کے حصے میں بھی آیا۔ حدیبیہ کا صلح نامہ آپؓ ہی نے تحریر کیا تھا۔

ایک غلط بات کی تردید

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق آپؓ کے دورِ خلافت ہی میں کچھ لوگوں کا خیال تھا‘ اور ایک گروہ نے تو اسے اپنے عقائد کا مستقل جزو بنا رکھا ہے کہ حضور ﷺ نے آپؓ کو ظاہری علوم کے علاوہ چند باطنی علوم کی تعلیم بھی دی تھی۔ یہ علوم سینہ بہ سینہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچے۔ اب یہ علوم امام مہدی کے پاس ہیں‘ جو اس گروہ کے عقیدے کے مطابق زندہ ہیں مگر کسی غار میں پوشیدہ ہیں‘ قیامت کے قریب وہ اپنے پوشیدہ مسکن سے نکلیں گے اور ان علومِ باطنیہ سے لوگوں کو آگاہ کریں گے۔ حالانکہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں نے آپؓ سے پوچھا کہ ’’قرآن کے سوا کچھ اور بھی آپ کے پاس ہے؟‘‘ فرمایا: ’’قسم ہے اُس ذات کی جو دانے کو پھاڑ کر درخت اُگاتا ہے‘ جو جان کو (جسم کے اندر) پیدا کرتا ہے‘ میرے پاس قرآن کے سوا کچھ اور نہیں۔ لیکن قرآن سمجھنے کی قوت (فہم) کی دولت خدا جس کو چاہے عطا

For more books visit :www.tanzeem.org

کرے۔اس کے علاوہ چند حدیثیں بھی میرے پاس ہیں جو میں بیان کرتا ہوں‘‘۔ چنانچہ اس غلط خیال کی تردید خود حضرت علی ؓ سے ثابت ہے۔

عدل وانصاف اور تفقّہ

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے متعدد صحابہ کرام ؓ کے خصوصی مناقب بیان ہوئے ہیں۔آپ حضرات نے جمعہ کے خطبہ ثانی میں سنا ہوگا‘ ہمارے خطیب خلفائے راشدینؓ کے متعلق حضورﷺ کے فرمائے ہوئے ان مناقب کو بیان کرتے ہیں: ’’اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ‘‘ (میری اُمت میں میری اُمت کے حق میں سب سے زیادہ رحیم وشفیق ابوبکر ہیں)۔ ’’وَاَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ‘‘ (اُمت میں اللہ کے احکام کے بارے میں سب سے زیادہ سخت‘ سب سے زیادہ شدید عمر ہیں)۔ ’’وَاَکْثَرُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ‘‘ (امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان ہیں)۔ ’’وَاَقْضَاھُمْ عَلِیٌّ‘‘ (اور امت میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں)۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ چنانچہ حضورﷺ مدینہ میں بعض اوقات قضا کی خدمت حضرت علی ؓ کے سپرد فرماتے تھے۔

جب اہل یمن نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرمﷺ نے وہاں کے عہدۂ قضا کے لیے آپؓ کو مقرر فرمایا۔ حضرت علیؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا یارسول اللہ! وہاں نئے نئے مقدمات پیش ہوں گے اور مجھے قضا کا تجربہ اور علم نہیں۔لیکن رسول اکرمﷺ کی نگاہ جوہر شناس آپؓ کی خفیہ صلاحیتوں کو جانتی تھی‘ لہٰذا حضورﷺ نے ان کو تسلی دی کہ ’’اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو ثبات واستقلال بخشے گا‘ تمہاری زبان کو حق بات کہنے کی سعادت عطا فرمائے گا اور صحیح فیصلے کرنے میں تمہاری نصرت فرمائے گا‘‘۔اس تسلی کے علاوہ حضورﷺ نے آپؓ کو قضا وفصلِ مقدمات کے لیے ہدایات بھی دیں۔مثلاً حضورﷺ نے فرمایا: ’’علیؓ جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے لگو تو اپنے فیصلے کو اُس وقت تک روکے رکھو جب تک دونوں فریقوں کے بیان اور ضروری شہادتوں کو نہ سن لو اور حقیقت معلوم کرنے کے لیے ان سے خوب جرح نہ کر لو‘‘۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ کی تسلی اور تعلیمات کے بعد پھر مجھے مقدمات کے فیصلوں میں کبھی تذبذب نہیں ہوا۔یمن کے قیام کے دوران آپ ؓ نے بعض عجیب وغریب مقدمات کا فیصلہ اپنی فراست سے فرمایا۔ان فیصلوں میں سے بعض کو حجۃ الوداع کے موقع پر حضورﷺ کی خدمت میں بطور اپیل پیش کیا گیا۔حضورﷺ نے حضرت علیؓ کے فیصلے کو سن کر تبسم فرمایا اور ان کو برقرار رکھا۔حضرت علیؓ کے فیصلے چونکہ قانونِ شریعت میں نظائر کی حیثیت رکھتے تھے‘ اس لیے اہل علم نے ان کو تحریری صورت میں مدوّن بھی کر لیا تھا لیکن سبائیوں نے ان میں بھی تحریف کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کے ایک حصہ کو اسی دور میں جعلی قرار دے دیا تھا‘ البتہ آنجنابؓ کے بعض صحیح فیصلوں سے امام ابوحنیفہ ؒ نے اپنی فقہ میں استنباط کیا ہے۔

تمام صحابہ کرام ؓ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی ؓ کو مقدمات‘ مناقشات‘ تنازعات اور خصومات کے فیصلوں اور قضا کی خصوصی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔حضرت عمر ؓ فرمایا کرتے تھے’’ہم میں مقدمات کے فیصلے کے لیے سب سے زیادہ موزوں علیؓ ہیں اور قرآن کے سب سے بڑے قاری اُبی بن کعبؓ ہیں‘‘۔اسی طرح فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کا قول ہے کہ تمام صحابہؓ کہا کرتے تھے کہ مدینہ والوں میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے حضرت علیؓ ہیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو بھی بعض اوقات حضرت علیؓ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔مسند احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ ؓ سے دریافت کیا کہ وضو کے بعد کتنے دن تک موزوں پر مسح کیا جاسکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ علیؓ سے معلوم کرو‘ کیونکہ وہ سفر میں حضورﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مسافر تین دن تین رات تک اور مقیم ایک دن ایک رات تک مسح کر سکتا ہے۔

جس زمانہ میں آپؓ کا حضرت معاویہؓ سے اختلاف چل رہا تھا‘ اس زمانے میں بھی ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے خط لکھ کر ایک مسئلہ دریافت کیا۔آپؓ نے مسکرا کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مخالفین بھی ’’تفقہ فی الدین‘‘ میں ہماری طرف رجوع کرتے ہیں اور مسئلہ کا جواب بجھوا دیا‘ جس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے عمل کیا۔

تحمل اور خوفِ خدا

رسول اللہ ﷺ کی یہ متفق علیہ حدیث پہلے گزر چکی ہے: ((لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ)) یعنی ’’قوی (پہلوان) وہ نہیں ہے جو مقابل کو پچھاڑ لے بلکہ (حقیقی) قوی اور پہلوان وہ ہے جو غصہ اور غیظ کی حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے‘‘۔ نبی اکرمﷺ کے اس ارشادِ گرامی کی کامل تعمیل سیرتِ علی ؓ میں نظر آتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی شخص کی ذاتی توہین وتذلیل کی جو مذموم حرکتیں دنیا میں رائج ہیں‘ ان میں دو نہایت گھناؤنی ہیں۔ایک یہ کہ کسی کو ماں بہن کی گالی دی جائے اور ایک یہ کہ اس کے منہ پر تھوک دیا جائے۔ان حرکتوں پر کمزور سے کمزور شخص بھی غصہ سے مغلوب ہوکر کانپنے لگتا ہے‘ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آجاتا ہے‘ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو تذلیل کرنے والے کی تکا بوٹی کر دے گا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے مواقع پر کسی قوی شخص کے جذبات کا عالم کیا ہوگا! آخر الذکر صورت کا ایک واقعہ حضرت علی ؓ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک غزوہ میں آنجنابؓ نے ایک کافر دشمن کو پچھاڑ لیا اور آپؓ چاہتے ہی تھے کہ تلوار سے اس کا سر قلم کر دیں کہ اس نے نیچے لیٹے لیٹے آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپؓ اس توہین و تذلیل پر برافروختہ ہونے کی بجائے اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔وہ مغلوب بھی حیران وپریشان اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے آپؓ سے دریافت کیا کہ میں نے تو یہ سمجھ کر کہ مجھے تو قتل ہونا ہی ہے‘ یہ انتہائی مذموم حرکت کی تھی‘ لیکن آپؓ نے مجھے چھوڑ دیا؟ آپؓ نے اسے جواب دیا کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔میں فی سبیل اللہ تم سے لڑ رہا تھا اور اسی لیے تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا‘ لیکن جب تم نے میرے منہ پر تھوکا تو اس کے ردِّعمل میں تمہارے خلاف میرے دل میں شدید غیظ وغضب پیدا ہوا۔ساتھ ہی مجھے اللہ کا خوف آیا کہ اگر اس موقع پر میں تمہیں قتل کروں گا تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ قتل اللہ کے نزدیک اس کی راہ میں قتل شمار نہ ہو بلکہ میرے ذاتی غصہ کے انتقام میں شمار ہو‘ اس لیے میں نے تم کو قتل کرنے سے ہاتھ روک لیا۔ یہ ہے تحمل‘ خشیتِ الٰہی اور حقیقی شجاعت کا عملی نمونہ جو ہمیں حضرت علی ؓ کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

For more books visit :www.tanzeem.org

شاہکارِ رسالت

غلام احمد پرویز صاحب نے حضرت عمرؓ کی سیرت کا عنوان ''شاہکارِ رسالت'' رکھا ہے' لیکن میرے رائے میں یہ لفظ حضرت علیؓ کی شخصیت کے لیے زیادہ موزوں ہے کیونکہ بالکل ابتدائی عمر سے ہی آپؓ کو حضورﷺ کی تربیت میں پرورش پانے کا موقع ملا۔ پھر ایمان لانے کے بعد سے ہجرت تک اور ہجرت کے بعد حضرت فاطمہؓ سے نکاح تک آپؓ حضورﷺ کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔

مکی دور میں حضرت علیؓ سے متعلق صرف چند واقعات روایات میں آتے ہیں' کیونکہ اُس وقت آپؓ کی عمر بہت چھوٹی تھی لیکن نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعات کافی اہم ہیں۔ پہلا واقعہ تیرہ برس کی عمر میں پیش آیا' جب حضورﷺ نے حکمِ خداوندی کی تعمیل میں بنو ہاشم کے کھانے کا اہتمام کیا تا کہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ اس کے جواب میں بنو ہاشم میں سے کھڑا ہوا تو کون! ایک تیرہ سالہ بچہ علیؓ بن ابی طالب۔ اس موقع پر ان کی زبان سے جو جملے نکلے وہ تاریخی جملے ہیں۔ ذرا چشمِ تصور سے دیکھیے کہ رسول اللہﷺ اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور حاضرین میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کھڑا ہوتا ہے تو تیرہ برس کا ایک بچہ اور کہتا ہے کہ ''اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں' اگرچہ میری آنکھیں دکھتی ہیں' اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں لیکن میں آپﷺ کا ساتھ دوں گا''۔ اور تمام لوگ قہقہہ لگا کر دلوں میں شاید یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ ہیں جو دنیا کی تاریخ کا رخ بدلنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور یہ تیرہ سالہ بچہ ہے جو ان کی مدد واعانت کے لیے خود کو پیش کر رہا ہے!

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کی رات حضورﷺ نے لوگوں کی وہ امانتیں جو آپﷺ کے پاس تھیں' حضرت علیؓ کے سپرد کیں اور انؓ کو اپنی جگہ اپنے بستر پر لیٹنے کی ہدایت فرما کر ہجرت کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اُس وقت حضرت علیؓ کی عمر بائیس تیئس برس ہوگی۔ رات بھر باہر دشمنانِ خدا ورسولﷺ کا محاصرہ رہا۔ اس خطرہ کی حالت میں بھی یہ نوجوان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ محوِ خواب رہا۔ یہ بھی آپؓ کی خفیہ شجاعت کا مظہر ہے۔ حضرت علیؓ کی شخصیت کے اصل جوہر مدنی دور میں ظاہر ہوئے' جن کا ایک اجمالی نقشہ میں آپ حضرات کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ مکی اور مدنی دور میں آپؓ کی عمر کے معاملہ کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

مکی دَور میں جو حضرات حضورﷺ کے ہم عمر تھے وہ اوّل روز سے آپﷺ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ایمان لاتے ہی دعوت وتبلیغ میں لگ گئے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ حضرات حضرت ابوبکرؓ کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں رسول اللہﷺ کے دامن سے آ کر وابستہ ہوئے۔ انہی میں عثمان غنیؓ' طلحہ' زبیر' عبدالرحمٰن بن عوف' ابوعبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ یہ سب لوگ قریش کے چوٹی کے گھرانوں کے موتی اور ہیرے ہیں۔ یہ مکی دور کی وہ سعید روحیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم اور نورِ فطرت عطا فرمایا تھا جو نورِ وحی سے جگمگا گیا' اور انہوں نے دعوتِ ایمان پر لبیک کہا اور راہِ حق میں نہایت مہیب مظالم برداشت کیے۔

صحابہؓ کی ایک درجہ بندی

اس موقع پر ایک ضمنی بات اور بھی سمجھ لیجیے۔ عام طور پر عمر کے لحاظ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صغارِ صحابہؓ اور کبارِ صحابہؓ دو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے لیکن ان میں درحقیقت ایک درمیانی نسل بھی تھی۔ کبارِ صحابہؓ تو وہ ہیں جو حضورﷺ کے ہم عمر تھے۔ ان میں حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' حمزہ' طلحہ' زبیر' عبدالرحمٰن بن عوف' یاسر اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مکی دور میں حضورﷺ کے دست و بازو بنے۔ اس سے اگلی نسل وہ ہے جو آنحضورﷺ سے عمر میں پچیس تیس برس کا فرق رکھتی تھی۔ حضرت علیؓ کا تعلق اس نسل سے تھا۔ حضرت علیؓ نبی اکرمﷺ سے قریباً تیس سال چھوٹے تھے۔ ان کے علاوہ اس نسل میں حضرت مصعب بن عمیر' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت خباب بن ارت' حضرت صہیب رومی' حضرت بلال اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم وغیرہم شامل تھے۔ یہ وہ نسل ہے جو آغازِ وحی کے وقت لڑکپن میں تھی یا حدودِ جوانی کو چھو رہی تھی۔ ان کا کوئی کارنامہ مکی دور میں نظر نہیں آتا۔ اُس دور میں شجاعت کا مظاہرہ کرنے والوں میں حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نام نمایاں ہیں۔

تیسری نسل میں وہ صحابہ کرامؓ شمار ہوں گے جنہوں نے ہجرت کے بعد مدینۃ النبیﷺ میں ہوش سنبھالا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت اسامہ بن زید' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم وغیرہم شامل ہیں۔ ان کا شمار صغارِ صحابہ میں ہوتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے باہمی تعلقات

جس طرح ہر انسانی معاشرے میں اختلافات ہمیشہ موجود رہے ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے' اسی طرح صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلافات ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے درمیان اس بغض وعداوت اور دشمنی کا کوئی وجود نہیں تھا' جس کو بنیاد بنا کر ابن سبا نے امت مسلمہ کو تفرقہ اور انتشار سے دوچار کر دیا۔ تاریخ کی کتابیں اور تذکرے ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں جو ان کے باہمی تعلقات کی فطری نوعیت یعنی ان کے درمیان اُلفت ومودّت اور اختلاف دونوں کی نوعیّتوں کو واضح کرتے ہیں۔

نیابتِ رسولﷺ

دیگر صحابہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کے تعلقات کے ذکر سے پہلے مناسب ہوگا کہ سیرت کا ایک اہم واقعہ ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضورﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے نائب کی حیثیت سے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا' مگر یہ بات حضرت علیؓ کے مزاج سے بعید تھی کہ وہ شرکتِ جہاد سے محرومی کو گوارا کر لیں۔ پھر کچھ منافقین نے طعنہ زنی بھی کی۔ چنانچہ آپؓ نے رنجیدہ ہو کر شکوہ کے انداز میں حضورﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں' دادِ شجاعت دیں اور میں عورتوں' بوڑھوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے مدینہ میں رہ جاؤں! حضرت سعدؓ بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی اس شکوہ آمیز التجا پر حضورﷺ نے فرمایا:

((اَلَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَیْسَ نَبِیٌّ بَعْدِیْ)) (۱)

''اے علی! کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ میرے ساتھ تمہارا وہی مقام' مرتبہ اور تعلق ہے جو ہارون کا موسیٰ علیہما السلام کے ساتھ تھا' سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔ یعنی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کی نیابت حضرت ہارون علیہ السلام کرتے تھے' اسی طرح میرے نائب کی حیثیت سے تم مدینہ میں رہو۔ البتہ چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام نبی بھی تھے لہٰذا حضور ﷺ نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرما دی کہ نبوت کا دروازہ تو اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

نیابتِ عمرؓ

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کی فتح کے موقع پر یروشلم تشریف لے گئے تو مدینہ میں اپنا نائب حضرت علیؓ ہی کو بنا کر گئے۔ ذرا سوچیے تو سہی' کیا کوئی حکمران ایک طویل سفر پر جاتے ہوئے اپنی جگہ کسی ایسے شخص کو بٹھائے گا جس پر اسے اعتماد نہ ہو مدینہ سے بیت المقدس کے فاصلے اور اُس دور میں اونٹ کے سفر کی رفتار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی مدینہ سے غیر حاضری کوئی چند روز کی بات نہ تھی۔ اور پھر سفر کی صورت بھی یہ تھی کہ ایک منزل تک حضرت عمرؓ اونٹ پر سوار ہوتے تو غلام پیدل چلتا اور اگلی منزل وہ غلام سوار ہوتا تو خلیفۃ المسلمین عمرؓ بن الخطاب اونٹ کی نکیل تھام کر پیدل چلتے تھے۔ گویا عملاً پیدل چلنے کی رفتار سے سفر طے ہو رہا تھا۔ دوسری مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُس وقت حضرت علیؓ کو اپنا نائب بنایا جب وہ اپنے دورِ خلافت میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے اُسوۂ رسول ﷺ پر عمل کرتے ہوئے حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں جس تیزی کے ساتھ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا ذرا اس کا اندازہ تو کیجیے! پورے پورے ملک یکے بعد دیگرے اقلیمِ اسلامی میں شامل ہو رہے تھے' بڑی بڑی آبادیاں اپنے تمام وسائل و ذرائع اور وسیع و عریض اراضی سمیت اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ رہی تھیں۔ اگر ان کا صحیح انتظام اور بندوبست نہ ہوتا تو بہت بڑی ہلاکت اور تباہی رونما ہوتی۔ میں نے لفظ ہلاکت یہاں جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں کہ **لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ** ''اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا''۔ فاروق اعظمؓ نے یہ کیوں کہا! اس لیے کہ آپؓ پر خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اور بہت سی دوسری ذمہ داریاں تھیں' خاص طور پر فوجوں کا انتظام و انصرام' محاذوں سے آنے والی اطلاعات کی روشنی میں مزید فوجوں کی کمک اور سامانِ رسد کی فراہمی اور ترسیل کے انتظامات' پھر وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے بحرانوں پر قابو پانے کی تدابیر پر غور و فکر اور ان کو روبعمل لانے کے انتظامات' ان تمام امور کی انجام دہی میں آپؓ مصروف و منہمک رہتے تھے۔ لہٰذا ریاست اسلامی کے داخلی انتظام کی طرف توجہ دینے کا آپؓ کو مناسب وقت نہیں ملتا تھا' آپؓ نے یہ سارا کام حضرت علیؓ کے ذمہ کر رکھا تھا۔ گویا حضرت علیؓ مشیر خاص اور چیف سیکرٹری تھے حضرت عمرؓ کے۔ خلافتِ فاروقی میں جتنے بھی حکومت کے انتظامی محکمے قائم ہوئے' ان میں سے اکثر حضرت علیؓ کی فہم و فراست کے رہینِ منت ہیں۔

حضرت علیؓ کی نظر میں حضرت عمرؓ کا مقام

سرزمینِ عراق پر پیش قدمی کا آغاز دورِ صدیقی میں ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مسندِ خلافت پر رونق افروز ہونے کے بعد عراق کی مہم کی تکمیل کو اوّلین کاموں کی فہرست میں شامل کیا اور اس محاذ پر تازہ فوج روانہ کی۔ لیکن ایک موقع پر مسلمانوں کے لشکر کو سخت ہزیمت ہوئی اور نو ہزار کی فوج میں سے چھ ہزار مجاہدین اس معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو ان کو بڑا صدمہ اور رنج ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تازہ کمک لے کر وہ خود محاذِ جنگ پر جائیں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے آپؓ کو روکا اور یہ فرمایا کہ چکیّ اُس وقت تک پیستی ہے جب تک اس کا دُھرا (کِلی) اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہے۔ اِس وقت آپؓ کا مقام چکیّ کے دُھرے کا ہے۔ امتِ مسلمہ کی یہ چکیّ اُس وقت تک چلے گی جب تک آپؓ اپنے مقام پر قائم رہیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورے کو قبول کیا اور خود محاذِ جنگ پر جانے کی بجائے حضرت علیؓ و دیگر اصحاب شوریٰ کے مشورے سے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (یکے از عشرۂ مبشرہؓ) کو افواج کا سپہ سالار بنا کر نئی فوجوں کے ساتھ ایران کی سرحدوں پر بھیجا۔ اس واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات میں کتنا قریبی قلبی تعلق تھا اور حضرت علیؓ کی نگاہِ دوررس میں حضرت عمرؓ کا کیا مقام تھا!

بنتِ علیؓ سے حضرت عمرؓ کا نکاح

اسی مقام پر ایک اہم واقعہ اور نوٹ کیجیے کہ حضرت علیؓ کی صاحبزادی' رسول اللہ ﷺ کی نواسی اور حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی نورِ چشم اُمِ کلثوم حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جب حضرت عمرؓ نے پیغام بھیجا تو حضرت علیؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ ابھی اس کی عمر کم ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ خاندانِ نبوت سے رشتہ استوار کروں۔ لہٰذا حضرت علیؓ نے ان کی خواہش کے احترام میں ۱۲ھ میں سیدہ ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا۔ غور کا مقام ہے کہ اگر ان حضرات میں باہمی محبت نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن ہوتا؟ اس نکاح کا ذکر تو اہل تشیع کی کتابوں میں بھی موجود ہے' اس لیے وہ اس کا انکار تو نہیں کر سکتے لیکن ایسی توجیہہ پیش کرتے ہیں جو حضرت علیؓ کی شجاعت' غیرت اور حمیت کے منافی ہے' کہ انہوں نے (معاذ اللہ) حضرت عمرؓ کی طرف سے قتل کی دھمکی سے خوفزدہ ہو کر یہ نکاح منظور کیا تھا......!!

حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ معاملہ

ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ سے ان کے دورِ خلافت کے ابتدائی ایام میں کچھ شکایت رہی اور یہ شکایت بے بنیاد نہ تھی۔ ایک شکایت یہ تھی کہ خلافت کا فیصلہ کرنے میں انہیں شریک نہیں کیا گیا۔ لیکن اس فیصلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے پہلے سے کسی سوچے ہوئے منصوبہ کا عمل دخل نہیں تھا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی انصارؓ کی کافی بڑی تعداد نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کی بحث چھیڑ دی اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کر دی۔ چند مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ بحث و تمحیص شروع ہو گئی۔ آپ خود

For more books visit :www.tanzeem.org

اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس موقع پر اگر ایک مرتبہ غلط فیصلہ ہو جاتا تو اس کو صحیح کرانے کے لیے خون کی ندیاں بہہ جاتیں مگر اس کو صحیح کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس نازک مرحلے پر جیسے ہی یہ خبر ملی' یہ دونوں حضراتؓ وہاں پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب نبی اکرمﷺ کا قول مبارک سنایا کہ ''اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ'' (۱) تو سارا مجمع دم بخود رہ گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کا نام تجویز کیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا لو' لیکن حضرت عمرؓ زبان سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھے اور ابوبکرؓ کا ہاتھ کھینچ کر ان سے خلافت کی بیعت کر لی۔ حضرت عمرؓ کے بیعت کرنے کے بعد انصار اور مہاجرین جو وہاں موجود تھے' حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے اپنی مؤمنانہ فراست کو کام میں لا کر اُمت کو بڑے فتنے سے بچا لیا۔ مگر حضرت علیؓ کے سامنے معاملے کی پوری تفصیلات نہیں تھیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب ان دونوں حضرات کی تنہائی میں گفتگو ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ نے پوری صورت حال حضرت علیؓ کے سامنے رکھی تو ان کا دل صاف ہو گیا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک دن ظہر کی نماز کے بعد حضرت علیؓ کی طرف سے عذر خواہی کی اور حضرت علیؓ نے شاندار الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کے فضل و شرف کا اعتراف کیا اور انؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر حضرت علیؓ پورے دورِ صدیقی میں حضرت ابوبکرؓ کے دست و بازو بنے رہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میں بھی کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی۔ حضرت فاطمہؓ اس بات کی مدعی تھیں کہ وراثت میں مجھے باغِ فدک ملنا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے حضورﷺ کا یہ قول تھا کہ ''لَا نُوْرَثُ' مَاتَرَکْنَا صَدَقَۃٌ'' (۱) ''ہم کسی کو وارث نہیں بناتے' جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے''۔ لہٰذا انہوں نے دخترِ رسول کی یہ خواہش پوری کرنے سے معذرت کر لی' جس پر حضرت فاطمہؓ رنجیدہ خاطر ہو گئیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی وفات سے قبل حضرت ابوبکرؓ نے انہیں بھی راضی کر لیا تھا۔ یہ حقائق ہیں۔ انسانوں میں اس قسم کی باہمی رنجش کا پیدا ہو جانا کوئی بعید از قیاس نہیں۔ سورۃ الحجر (آیت ۴۷) میں ارشادِ ربانی ہے کہ ''ہم اہل ایمان (کو جب جنت میں داخل کریں گے تو ان) کے دلوں میں جو رنجشیں ہوں گی انہیں نکال دیں گے۔ وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہماری تفاسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت میرے اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے' ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے میل آ گیا ہے' جنت میں داخل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس میل اور رنجش کو دور کر دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی یقیناً انسان تھے' لیکن ان کی طبیعت اور ان کی اعلیٰ سیرت و کردار کا جو نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے اس کے پیش نظر ان کے مابین کسی وقتی رنجش یا کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کو ہم تسلیم کرتے ہیں' البتہ کوئی مستقل بغض' کوئی کدورت' ایک دوسرے سے کوئی مستقل دشمنی و عداوت کا ہم کوئی تصور تک نہیں کر سکتے۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!

امیر معاویہؓ کا ایک تأثر

مولانا معین الدین ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ''خلفائے راشدین'' میں امیر معاویہؓ کے دربارِ خلافت کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ دربار میں حضرت امیر معاویہؓ نے ضرار اسدی سے کہا جو حضرت علیؓ کے حامیوں میں رہے تھے کہ حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کرو۔ پہلے تو ضرار نے معذرت کی لیکن امیر معاویہؓ کے اصرار پر وہ بولے کہ اگر اصرار ہے تو سنیے۔

> ''وہ (حضرت علیؓ) بلند حوصلہ اور قوی تھے' فیصلہ کن بات کہتے تھے' عادلانہ فیصلے کرتے تھے۔ ان کے ہر جانب علم کا چشمہ پھوٹتا تھا۔ ان کے تمام اطراف سے حکمت ٹپکتی تھی۔ دنیا کی دلفریبی اور شادابی سے وحشت کرتے اور رات کی وحشت ناکی سے انس رکھتے تھے۔ بڑے رونے والے اور بہت غور و فکر کرنے والے تھے۔ معمولی لباس اور موٹا جھوٹا کھانا پسند تھا۔ ہم میں بالکل ہماری طرح رہتے تھے۔ جب ہم ان سے سوال کرتے تھے تو وہ ہمارا جواب دیتے تھے اور جب ہم ان سے انتظار کی درخواست کرتے تو وہ ہمارا انتظار کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنی خوش خلقی سے ہم کو اپنے قریب کر لیتے تھے اور خود ہم سے قریب ہو جاتے تھے' خدا کی قسم ان کی ہیبت سے ہم ان سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اہلِ دین کی عزت کرتے تھے۔ غریبوں کو مقرب بناتے تھے۔ قوی کو اس کے باطن میں حرص و طمع کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ان کے انصاف سے ضعیف ناامید نہیں ہوتا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے ان کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ رات گزر چکی ہے' ستارے ڈوب چکے ہیں اور وہ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے ایسے مضطرب ہیں جیسے مارگزیدہ مضطرب ہوتا ہے اور اس حالت میں وہ غمزدہ آدمی کی طرح رو رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دنیا مجھ کو فریب نہ دے' دوسرے کو دے' تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے یا میری مشتاق ہوتی ہے' افسوس افسوس میں نے تجھ کو تین طلاقیں دے دی ہیں' جس سے رجعت نہیں۔ تیری عمر کم' اور تیرا مقصد حقیر ہے' آہ زادِ راہ کم اور سفر دور دراز کا ہے۔ راستہ وحشت خیز ہے۔''

یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا ''اللہ تعالیٰ ابوالحسن (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ) پر رحم کرے۔ خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔''

اصحابِ رسولؐ میں حضرت علیؓ کا مقام

ہمارا عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہیں جناب محمدٌ رسول اللہﷺ کی صحبت اور آپﷺ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہِ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی' انبیاء و رُسل کے بعد پوری نسلِ انسانی میں من حیث الجماعت افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ انؓ کی محبت جزوِ ایمان ہے' ان کی تعظیم و توقیر دراصل نبی اکرمﷺ کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین درحقیقت حضورﷺ سے بغض و عداوت اور حضورﷺ کی تحقیر و توہین ہے۔ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن متعین طور پر فضیلت کی ترتیب یہ ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحابؓ بیعتِ رضوان کو۔ پھر ان پر ایک مزید درجۂ فضیلت حاصل ہے حضرات عشرہ مبشرہؓ اور ان میں فضیلتِ مطلقہ حاصل ہے۔ حضرات اصحابِ بدر کو۔ پھر ان پر ایک درجۂ فضیلت کے حامل ہیں حضرات خلفاءِ اربعہؓ کو۔ پھر ان میں فضیلت ترتیبِ خلافت کے مطابق ہے یعنی رسول اللہﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا' پھر مقام ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کا' اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا۔

اب اگر کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے تو سوچیے کہ اس کی زد کہاں کہاں پڑے گی۔ کیا حضرت علیؓ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت اس دریدہ دہنی سے محفوظ رہ سکے گی......!!

For more books visit :www.tanzeem.org

خاتمۂ کلام

یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ اگرچہ جامع الصفات انسان تھے‘ انؓ کی شخصیت میں ’’Ambivert‘‘ کی تمام خصوصیات موجود تھیں اور اگرچہ آپؓ اپنی ذاتی حیثیت میں خلیفۂ راشد تھے‘ لیکن یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ آپؓ کے عہدِ خلافت میں باہمی اختلاف رہا۔ اُمت آپؓ کی خلافت پر مجتمع نہ ہوسکی۔ باہمی خانہ جنگی رہی۔ جنگِ جمل‘ جنگِ صفین اور جنگِ نہروان جیسے خونیں معرکے ہوئے۔ بڑے بڑے فتنے اس دور میں کھڑے ہوگئے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان فتنوں پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی‘ لیکن سبائی فتنہ کے شجرِ خبیثہ کی جڑیں زمین میں اتنی گہری اُتر چکی تھیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود حضرت علیؓ کے لیے ان پر تنہا قابو پانا ممکن نہ ہوسکا۔ اگر اُس وقت مخلص‘ بااثر اور صائب الرائے حضرات ایک بنیانِ مرصوص بن جاتے اور حضرت علیؓ کی پشت پناہی کرتے تو شاید حالات سُدھر جاتے۔ لیکن سبائی سازش نے غلط فہمیوں کا اتنا گھنا جنگل کھڑا کر دیا تھا کہ اس کا صاف ہونا ممکن نہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں اُمت کے اندر فرقہ آرائی اور گروہ بندی کی ایسی گرہ لگ گئی ہے جو نہ اُس وقت کھل سکی اور نہ شاید قیامت تک کسی کے ناخنِ تدبیر سے کھل سکے۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ‘ اس کا کوئی الزام حضرت علیؓ کی ذات پر نہیں ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ یہ انؓ کی کوتاہی تھی یا انؓ کی عدمِ صلاحیت تھی‘ یا اہلیت کی کمی تھی تو دراصل وہ تاریخ کو نہیں جانتا‘ وہ حقائق کا فہم نہیں رکھتا۔

اقول قولی هٰذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات